زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

سنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

احمد فراز کی چونسٹھوئیں سالگرہ کے موقعہ پر اشاعتِ خاص

زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

جلد:۳۔ شمارہ: ۳۰-۳۱ـ جنوری۔ فروری ۱۹۹۵ء

مجلس ادارت

مدیر اعلیٰ اعزازی -------- سید ضمیر جعفری

مدیر مسئول ---------- گلزار جاوید

مجلس مشاورت

ناصر زیدی ــــ حمیرا رحمٰن (نیو یارک) ــــ ڈاکٹر انور نسیم

قیمت

شمارہ خاص	35 روپے
چھ شمارے	125 روپے
زر سالانہ	250 روپے

بیرون ملک
(ہوائی ڈاک سے)

امریکہ۔ کینیڈا	40 ڈالر
برطانیہ	20 پونڈ
سعودی عرب	80 ریال
متحدہ عرب امارات	80 درہم
قطر	ایضاً
شارجہ	ایضاً

رابطہ:۔ ۲۵۷۹۔اے گوالمنڈی راولپنڈی۔ ۴۶۰۰۰ فون۔ ۵۲۰۵۷۹ فیکس 419040

پبلشر: گلزار جاوید، طابع فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

قرطاس اعزاز

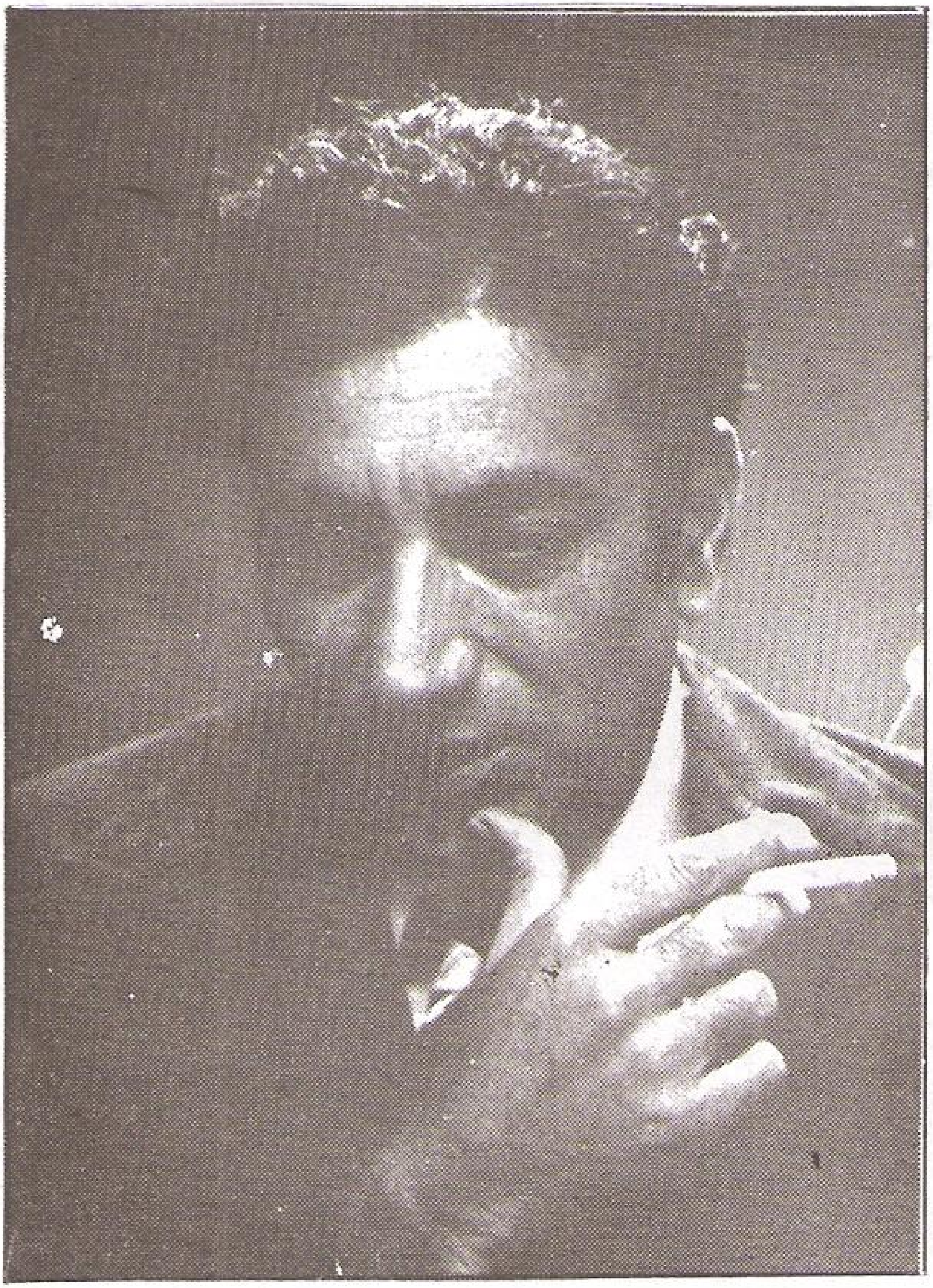

احمد فراز کے نام

ترتیب

قرطاسِ اعزاز 3
بائیو ڈیٹا........ 4
شجرۂ نسب........ 6
ابیات...... احمد فراز 7
براہِ راست...... گلزار جاوید 8
فیض صاحب اور میں...... احمد فراز 16
فراز کی شاعری کے انگریزی تراجم...... فیض احمد فیض 18
احمد فراز کی شاعری --- ایک مختصر تاثر...... احمد ندیم قاسمی 19
اردو شاعری کا سکندرِ اعظم...... سید ضمیر جعفری 21
محبتوں کا شاعر...... پروین شاکر 25
عہدِ موجود کا سب سے بڑا شاعر........ ناصر زیدی 30
اک طائرِ خوش رنگ........ شبنم شکیل 33
احمد فراز........ حسن عباس رضا 34
کلام خود بقلم خود...... احمد فراز 36
تازہ کلام.... احمد فراز 37
انتخابِ کلام...... 40
روشنیوں کا شہر --- منظوم ڈرامہ........ احمد فراز 75
فراز صاحب کے کلام کے تراجم........ 86
حرفِ تحسن...... 90
سلۂ جنوں...... مسعود قریشی 94

افسانے

"قفس"........ سعید شیخ 96
جسٹس آف گاڈ........ گلزار جاوید 101

سفرنامہ

بحر اوقیانوس کے اس پار...... سید ضمیر جعفری 103
گیتو کی گیتا...... انوار شریف 106
نشانِ راہ...... نیلوفر سلطانہ 109
عہد حاضر میں غزل کی اہمیت...... قرۃ العین طاہرہ 111
قلمے دکتابے...... 114
بساطِ بشاشت 115
ڈاکٹر انعام الحق جاوید، سرفراز شاہد، غلام علی بلبل
امجد اسلام امجد کے اعزاز میں شام...... مصطفیٰ شان 117
رس رابطے 118

BIO-DATA

نام: سید احمد شاہ

تخلص: فراز 1949ء

پیدائش 12 جنوری 1931ء کوہاٹ

تعلیم: ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول کوہاٹ

میٹرک: ایڈورڈز کالج پشاور

بی اے: ایڈورڈز کالج پشاور

ایم اے اردو ایم اے فارسی پشاور یونیورسٹی پشاور

والد: سید محمد شاہ برق 1903ء تا 1979ء)

آغا برق کوہاٹی اردو فارسی کے بلند پایہ شاعر

بیٹے حامد شاہ کے انتقال کی خبر سن کر صدمے کے باعث انتقال مدفون (کوہاٹ)

والدہ: سیدہ امیر جان

بہن بھائی: سید محمود شاہ (برادر بزرگ) برٹش ایرویز

افتخار ناہید (خواہر خورد) مقیم راولپنڈی

سید حامد شاہ مرحوم آر کیٹیکٹ لندن میں تعلیم وہیں ملازمت اور 34 سال کی عمر میں وہیں انتقال مدفون کوہاٹ

سید مسعود کوثر (بیرسٹر سابق صوبائی وزیر اور اسپیکر سرحد اسمبلی حال سینیٹر)

پہلی شادی: اوائل عمری میں۔

دوسری شادی: 1956ء ہمراہ ریحانہ فراز۔ سول سرونٹ (جائنٹ سیکرٹری

بیٹے: سعدی فراز۔ میجر

شبلی فراز: امریکہ میں ایم بی اے کرنے کے بعد وہیں ملازمت کر رہے ہیں۔

سرمد فراز: 9th کلاس کے طالب علم

ملازمت: اسکرپٹ رائٹر۔ ریڈیو پاکستان کراچی 50تا51

2) اسکرپٹ رائٹر۔ ریڈیو پاکستان پشاور 52تا57

3) پروگرام پروڈیوسر ریڈیو پاکستان پشاور 59تا61

4) لیکچرر پشاور یونیورسٹی 61تا71

5) ڈائریکٹر پاکستان نیشنل سنٹر (پشاور۔ اسلام آباد) 71تا76

6) ڈائریکٹر جنرل اکادمی ادبیات پاکستان 76تا78

7) ریذیڈنٹ ڈائریکٹر پاکستان نیشنل سنٹر ہیڈ آفس 78تا80

8) ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل پاکستان نیشنل سینٹر 87تا89

9) چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان 89تا90

10) سربراہ لوک ورثہ پاکستان 90تا91

11) منیجنگ ڈائریکٹر پاکستان بک فاؤنڈیشن فروری 1994ء تاحال

ادارت: ماہنامہ اشتیاق پشاور 1953ء تا 55

ہفت روزہ خادم پشاور 55تا57

ماہنامہ داستان پشاور 65تا67

اسیری: یکم مئی 1978ء قید تنہائی مانسر کیمپ

جون 1982ء صوبہ بدری (سندھ)

جلاوطنی: 1982ء تا 1986ء

تصانیف: تنہا تنہا (شاعری)۔ 1958ء

دردِ آشوب (شاعری) آدم جی ایوارڈ یافتہ 1966ء

شب خون (قومی نظمیں) 1971ء

نایافت (شاعری) 1970ء

میرے خواب ریزہ ریزہ (منظوم ڈرامے) 1972ء

جاناں جاناں (شاعری) 1976ء

بے آواز گلی کوچوں میں (شاعری) (مطبوعہ لندن) 1982ء

نابینا شہر میں آئینہ (مطبوعہ مانٹریال کینیڈا) 1984ء

سب آوازیں میری ہیں (جنوبی افریقہ کے شعراء کی نظموں کا ترجمہ) 1985 سویڈن

پس انداز موسم (شاعری) علامہ اقبال ایوارڈ اکادمی ادبیات پاکستان 1989ء

بودلک (منظوم ڈرامہ) 1994ء

خوابِ گل پریشاں ہے (شاعری) 1994

تراجم محبت کا شہر (یوگوسلاویہ)

عظمتِ آدم (سویڈش)

Wiland and wildeness انگریزی۔ مانٹریال (کینیڈا)

Banish Dreems انگریزی (لندن)

اس کے علاوہ روسی، فرانسیسی، چینی، ویت نامی، ہندی، پنجابی، پشتو وغیرہ

ایوارڈ: آدم جی ایوارڈ 1966ء

دھنک ایوارڈ "مقبول ترین شاعر" 1973ء

فراق گورکھپوری عالمی ایوارڈ 1988ء

اباسین ایوارڈ اباسین آرٹ کونسل لاہور 1990ء
ڈاکٹر محمد اقبال ایوارڈ 1989ء
لٹریری انٹرنیشنل ایوارڈ اکیڈمی آف لٹریچر ٹرانٹو (کینیڈا) 1991ء
ٹاٹا ایوارڈ جمشید نگر بھارت (برائے فن اور امن) 1992ء
نقوش ایوارڈ بہترین غزل گو (1993-1992ء)
ستارۂ امتیاز 1994ء
ڈاکٹر آف لٹریچر کراچی یونیورسٹی فروری 1995ء

مقالہ ایم اے اردو۔۔۔ فن و شخصیت۔ محمد شفیق بھٹی بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی
غزل جامعہ ملیہ ہے۔۔۔ دہلی بھارت

بین الاقوامی دورے: افغانستان، ایران، عراق، سعودی عرب، مشرق وسطی، ترکی، یوگوسلاویہ، چیکوسلاواکیہ، بلغاریہ، روس، چین، انگلستان، سویڈن، ناروے، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ، اسپین، جرمنی، فرانس، ہالینڈ، بلجیئم، آسٹریا، اٹلی، امریکہ، کینیڈا، نائیجیریا، ہندوستان

* * *

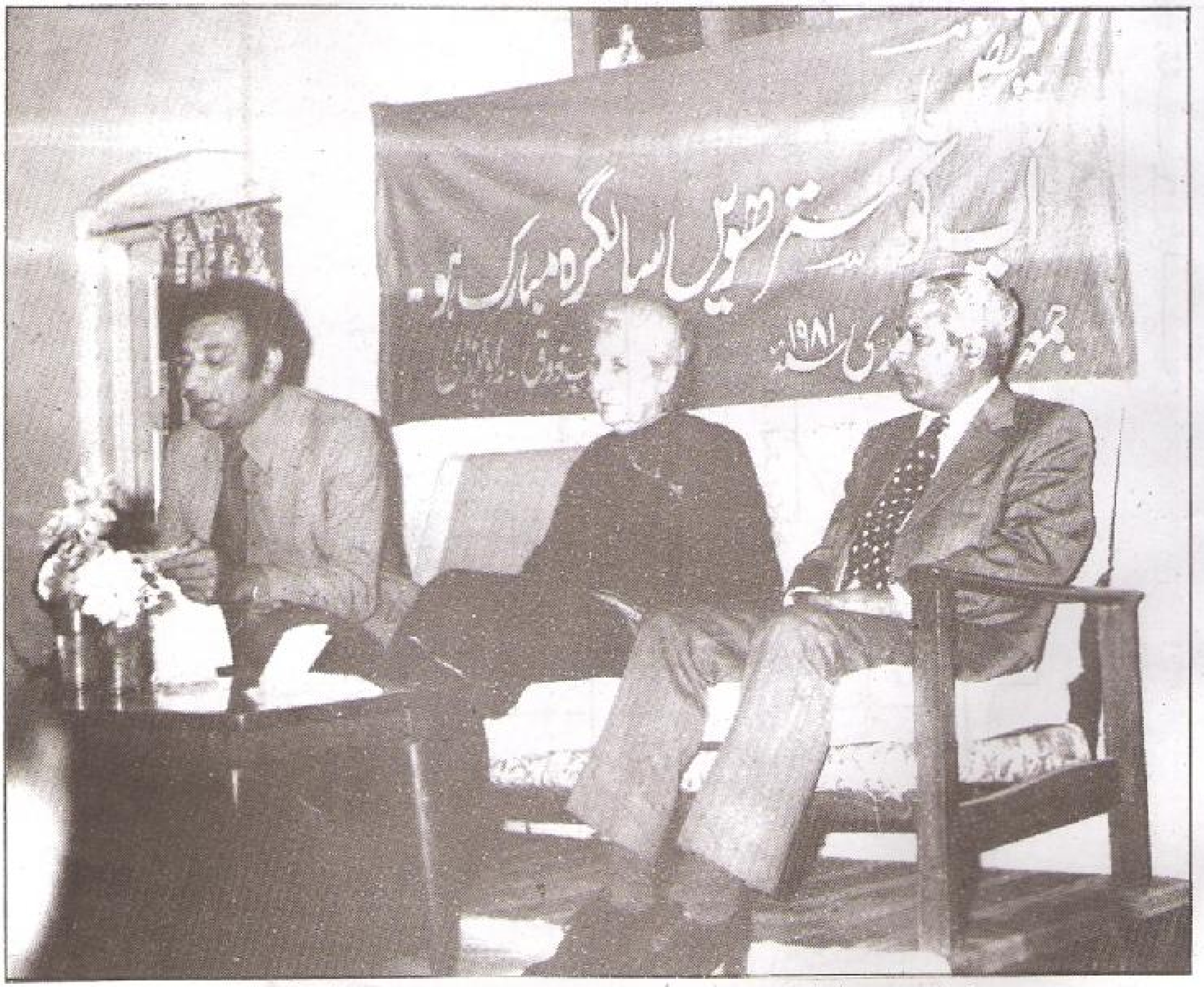
آپ کو سترھویں سالگرہ مبارک ہو۔
جمہوری ۱۹۸۱

فیض کی سترھویں سالگرہ کی تقریب 20 فروری 1981ء پریس کلب راولپنڈی احمد فراز، فیض، فتح محمد ملک

شجرۂ نسب

اولاد محمد قاسم پسر حضرت حاجی بہادر

(ل)

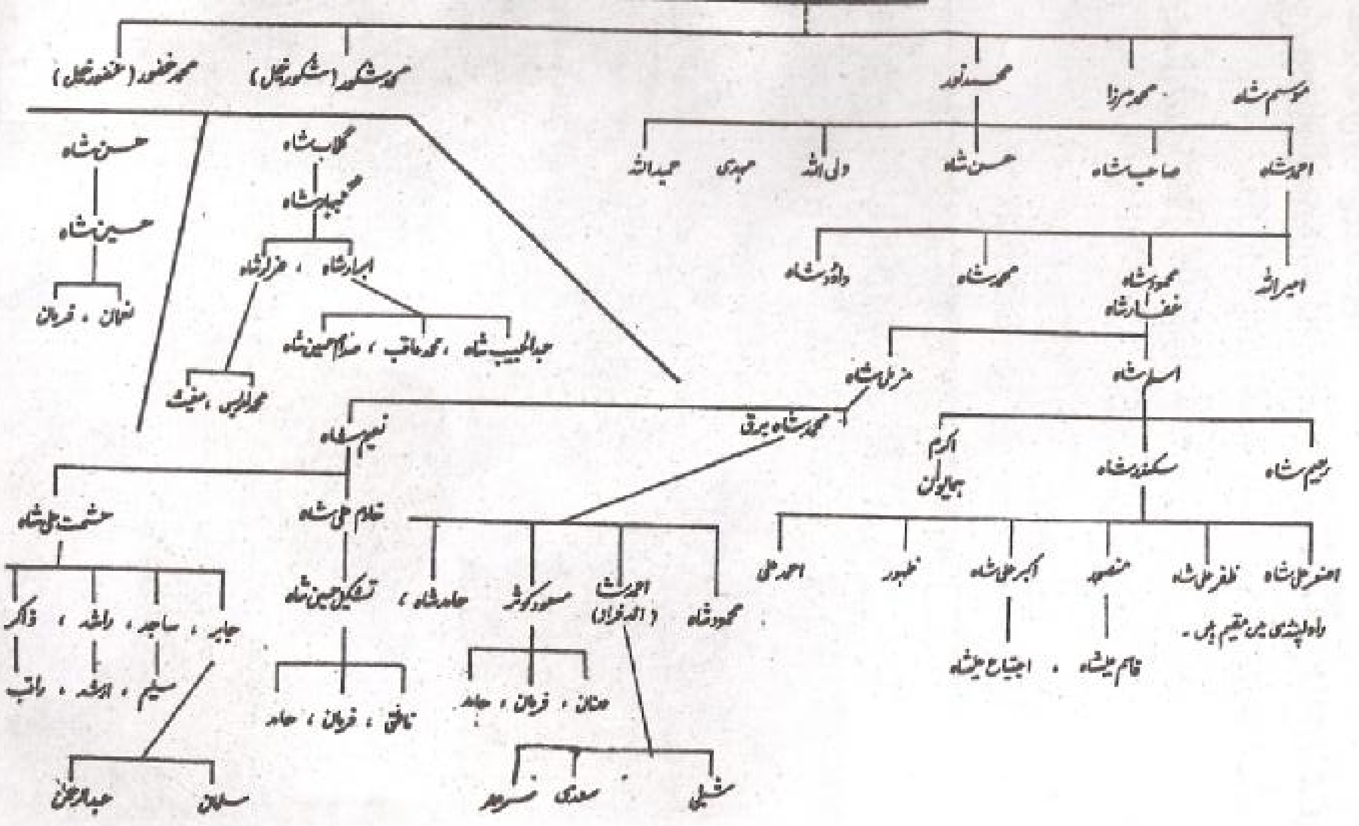
موسیٰ شاہ
محمد مرزا
محمد نور
محمد شکور (اشکور خیل)
محمد غفور (غفور خیل)
احمد شاہ
صاحب شاہ
حسن شاہ
ولی اللہ
مہدی
عبداللہ
امیر اللہ
محمود شاہ
محمد شاہ
داؤد شاہ
غفار شاہ
اسلم شاہ
مزمل شاہ
محمد شاہ برق
رحیم شاہ
سکندر شاہ
اکرم
ہمایون
اصغر علی شاہ
ظفر علی شاہ
منصور
اکبر علی شاہ
ظہور
احمد علی
راولپنڈی میں مقیم ہیں۔
قاسم علی شاہ ، اجتباع علی شاہ
حسن شاہ
حسین شاہ
نعمان ، فرحان
گلاب شاہ
محبوب شاہ
ابرار شاہ ، عزیز شاہ
عبدالحسیب شاہ ، محمد ثاقب ، صدام حسین شاہ
محمد ادریس ، مغیث
نعیم شاہ
حشمت علی شاہ
غلام علی شاہ
جابر ، ساجد ، راشد ، ذاکر
سلیم ، ارشد ، راقب
عبدالرحمٰن
سلمان
تشکیل حسین شاہ
فائق ، فرحان ، حامد
محمود شاہ
احمد شاہ (الدخوان)
مسعود کوثر
حامد شاہ ،
عثمان ، فرحان ، حامد
شبلی
سعدی
مسرور

ابیات

بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

احمد فراز

مرے رسولؐ کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صبح کے حوالوں سے

مگر یہ مفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ
جو معتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

نہ میری نعت کی محتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

خدا کے نام کو بیچیں مگر خدا نہ کرے
اثر پذیر ہوں خلقِ خدا کے نالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظلم کی مثالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مشکبو ہے لباس
کہ میرے دل کا ہے رشتہ خراب حالوں سے

ترا پیام محبت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پُر نفرتوں کے جالوں سے

ہے تُرش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

یہ افتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صلح کروں قتل کرنے والوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہوں قبا و کلاہ والوں سے

براہِ راست

گلزار جاوید

اردو کا شمار وبلاشبہ دنیا کی چند خوش بخت زبانوں میں کیا جا سکتا ہے جنہیں تسلسل کے ساتھ اعلیٰ تخلیقی جوہر کی حامل بلند مرتبت شخصیات کے زیرِ سایہ پھلنے پھولنے کے عمدہ مواقع میسّر رہے۔ ——

میر و غالب سے شروع ہو کر احمد فراز تک یہ فہرست نہایت طویل اور قابلِ احترام ہے جس نے ہمارے نصب العین کے حصول میں ہر قدم پر ہمیں نہ صرف رہنمائی بخشی بلکہ ہمارے قومی و ادبی ورثہ کو زنگ آلود ہونے سے بچائے رکھا۔ اِن ہی بے لوث و بے غرض لوگوں کے طفیل ہمارے جسم میں دوڑتے لہو کی حرارت باقی ہے اور اسی کی روشنی میں ہماری منزل کا نشان پنہاں ہے۔

آیئے ہم قدم و ہم آواز ہو کر اپنے دلوں کے ترجمان عظیم شاعر جناب احمد فراز کو اُن کی چونسٹھویں سالگرہ کے موقع پر اُن ہی کے الفاظ میں ہدیۂ تبریک پیش کریں:

جگر فگار کرو دل کو تار تار کرو ؟
یہی صلے ہیں اگر آگہی کے یونہی سہی

○ پہلا سوال تو روایتی ہی ہے جس میں ہم شعر و سخن سے آپ کی آشنائی کی بابت جاننا چاہیں گے؟

○○ اصل میں ہر چند میرے والد شعر کہتے تھے اور وہ اردو فارسی اور عربی کے عالم تھے زیادہ تر اردو فارسی میں شعر کہتے تھے فارسی میں ان کی کتاب "فروغ جاوداں" کے نام سے دستیاب ہے لیکن اس سے زیادہ جس چیز نے مجھے شاعری کی طرف مائل کیا وہ سبب میری ایک ہم جماعت لڑکی نے مجھے بیت بازی کی دعوت دے کر فراہم کیا گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم دونوں اکٹھے پڑھا کرتے تھے ایک دن اس نے مجھ سے دریافت کیا "تمہیں بیت بازی آتی ہے میں نے کہا وہ کیا ہوتی ہے جواب میں مجھے اس نے بتلایا کہ میں شعر پڑھوں گی جس لفظ پر وہ شعر ختم ہوگا آپ شعر پڑھیں گے پھر میں پڑھوں گی اور ہار جیت تک یہ سلسلہ جاری رہے گا یہاں سے شعر یاد

کرنے کا سلسلہ شروع ہوا مگر تادیر جاری نہ رہ سکا کیونکہ اس لڑکی کے شعری ذخیرے کے مقابلے میں میرا ذخیرہ نہ ہونے کے برابر تھا چنانچہ ایک دن سوچا کیوں نہ شعر خود تیار کیا جائے شعر بنانے کا معاملہ ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا کہ ایک دن والد صاحب سیل سے کپڑا خرید کر لائے میرے بڑے بھائی جو اس وقت ایف اے کے طالب علم تھے ان کے لیے سوٹ اور میرے لیے کشمیرا چیک لے آئے گو آج کل میں اس کا بڑا شوقین ہوں مگر اس وقت مجھے وہ کمبل کی مانند لگا اور میں نے اپنے جذبات کی ترجمانی میں ایک شعر بنایا اور کاغذ پر لکھ کر اس کپڑے کے ساتھ والد صاحب کے سرہانے رکھ دیا۔

جب کہ سب کے واسطے لائے ہیں کپڑے سیل سے
لائے ہیں میرے لیے قیدی کا کمبل جیل سے

گو کہ فنی لحاظ سے یہ شعر اتنی اہمیت کا حامل نہیں مگر طبقاتی ناہمواری کے بارے میں میرے اختلافی جذبات کا ترجمان ضرور تھا جو کہ میں نے احتجاج کے طور پر کہا تھا میری بعد کی احتجاجی شاعری کی بنیاد آپ اسی شعر کو کہہ سکتے ہیں۔

○ یہ فرمایئے کہ آپ کے اس احتجاجی شعر پر والد صاحب قبلہ کا رد عمل کیا تھا؟

○○ بہت خوش ہوئے اور ہنسے بھی اور فوری طور پر بازار جا کر میرے لیے مختلف قسم کے کپڑے خرید لائے اس سے مجھے شاعری کی تاثیر کا احساس ہوا اور یہ بھی علم ہوا کہ شاعری احتجاج کا موثر ترین ذریعہ ہے؟

○ آپ کے شاعر بننے کی وجہ جو خاتون ٹھہریں کیا آج وہ اس عظیم احمد فراز سے واقف ہیں جن سے ہم مستفید ہو رہے ہیں؟

○○ ہم قریب کوئی 25 سال بعد ملے کیونکہ تعلیم سے فراغت کے بعد ان کی شادی ہو گئی اور پتہ نہیں چلا کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے مگر ایک عمر اس قربت کا عکس میرے ذہن پر قائم رہا مگر میں نے گاہے بگاہے ان کی تلاش کا سلسلہ جاری رکھا ایک دن اتفاق سے ائیرپورٹ پر ان کی ہمشیرہ سے ملاقات ہو گئی جنھوں نے ان کا پتہ فراہم کیا یوں پچیس سال کے طویل عرصہ گزر جانے کے بعد میں ان سے جا کر ملا انھیں دیکھتے ہی مجھے شدید صدمے کا سامنا کرنا پڑا میرے ذہن میں قائم حسن و مروت کے پیکر کی جو یاد زندہ تھی اس تصور کو زمانے کے گرم سرد نے بری طرح بگاڑ کر رکھ دیا تھا مالی طور پر وہ ضرور آسودہ تھیں مگر ان کا حسن دل کشی و رعنائی بے وفائی کر چکے تھے بہتر ہوتا کہ میں ان سے اس حال میں نہ ملتا۔

○ اچھا یہ فرمایئے گزرے ہوئے ان پچیس سالوں کے بیچ کبھی ان خاتون کو یہ علم بھی ہوا کہ آج کے دور کا نہایت ہی بلند قامت رومانی و انقلابی شاعر ان کا وہی ہم جماعت ہے جسے بیت بازی کا مفہوم بھی معلوم نہ تھا؟

○○ اس وقت مہلت نہ ملی یا شاید میرے ذہن میں یہ سوال نہ آیا ہاں البتہ وہ اپنے جس ہم جماعت کو جانتی تھی اس کا نام صرف احمد تھا فراز تخلص میں نے خاصا بعد میں اختیار کیا میں نے ملاقاتی کارڈ احمد فراز کا بھیجا وہ تپاک سے ملیں اور انہوں نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار بھی نہ کیا میرا خیال ہے میڈیا کی وساطت سے وہ مجھے یقیناً پہچانتی ہوں گی کیونکہ زمانے نے میرے خدوخال کے ساتھ بے رحمانہ سلوک نہیں کیا۔

○ شعر و سخن کے حوالے سے میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کا شعری آہنگ کس دبستان ادب کی نمائندگی کرتا ہے؟

○○ دیکھیے اس باب میں صائب رائے تو میرے ناقدین اور قارئین کی ہی مقدم ہو گی آپ میرے تخلیقی انداز کو نیم کلاسیکل سے تعبیر کر سکتے ہیں میری غزل کو کلاسیکی شاعری میں شمار کیا جا سکتا ہے جس میں میرے تجربات اور مضامین دوسروں سے قطعی مختلف ہیں البتہ میری نظم کے موضوعات خالصتاً میرے اپنے زمانے کی تاریخ کا حصہ ہیں اسی سے میں نے مواد چنا اور اسی کو شاعری میں ڈھالا۔

○ ابتدا میں آپ کا امیج رومان پسند شاعر کا تھا تلخی کب اور کیونکر آپ کے کلام میں دخیل ہوئی؟

○○ میں یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ میں سونے یا چاندی کا چمچ منہ میں لے کر پیدا نہیں ہوا میرا تعلق ایک متوسط خاندان سے ہے۔ جس کے باعث مجھے بھی بہت سی محرومیوں اور مسائل کا سامنا رہا میرا پہلا شعر ہی میری فکر کو نمایاں کرتا نظر آتا ہے جو لوگ ابتدا میں مجھے رومان پرور شاعر گردانتے ہیں انہوں نے شاید تنہا تنہا اور درد آشوب میں شامل میری ابتدائی شاعری کو بغور نہیں پڑھا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ میری حساسیت کے باعث معاشرے میں پائے جانے والے تضادات کے سبب جوں جوں شعور پختہ ہوتا گیا اسی طرح طبقاتی ناہمواری کے خلاف میری آواز بلند تر ہوتی گئی۔

○ کیا آپ کے احتجاجی رویے سے معاشرے کو کسی قسم کا فیض حاصل ہوا؟

○○ اک میں ہی نہیں اہل قلم کا پورا گروپ تھا جس میں ادیب بھی شامل تھے اور شاعر بھی جنہوں نے زندگی کا نظام بدلنے کے لیے پوری قوت سے قلمی جہاد کیا اور یہ قوت ترقی پسند تحریک کی شکل میں نمایاں ہوئی۔

○ بات ترقی پسندی کی ہوئی تو اس حوالے سے ہی آگے بڑھتے ہوئے میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ نے تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے اردو شاعری کو تازگی کی نئی لذت سے آشنا کیا کیا آپ خود کو کسی صنف یا طرز کا بانی تصور کرتے ہیں؟

○○ اس اعتبار سے تو نہیں کہ ہیئتی طور پر میں نے کوئی نیا تجربہ کیا ہو یا کسی صنف سے انحراف کیا ہو میں نے تو مروجہ اصناف غزل، نظم، قطعہ رباعی میں نئے خیالات کو

روشناس کرایا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ کلاسیکل غزل بلکہ پوری غزل کی تاریخ روایتی محبت پر استوار ہے میں سمجھتا ہوں کہ محبت میں اپنا اپنا تجربہ ہوتا ہے یہاں مجنوں اور فرہاد زیادہ معتبر نہیں اگر سچے جذبے سے اپنی بات کی جائے تو اس میں زیادہ تازگی اور شگفتگی ہوتی ہے جسے لوگ بھی زیادہ پسند کرتے ہیں۔

○ کیا آپ شاعری کو جدید وقدیم 'عشقیہ والمیہ 'سنجیدہ مزاحیہ ترقی وغیر ترقی پسند کے پیمانوں سے ماپنے کے قائل ہیں؟

○○ بات یہ ہے کہ شاعری نام ہے بے ساختگی کا جسے تکنیک اور مہارت سے سجایا اور سنوار تو جاسکتا ہے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا میں نے اپنی حد تک اپنے تجربات اور مشاہدات کو آزادی سے قرطاس پر منتقل کیا میں نے کبھی پلینڈ سیکجُول یا شیڈولڈ شاعری نہیں کی اور نہ میں اسے مناسب سمجھتا ہوں۔

○ آپ کے رومان بہت مشہور ہوئے کسی قدر سکینڈل بھی منظر عام پر آئے ان میں کسقدر صداقت تھی۔

○○ بھئی جیسے دوسرے لوگ عشق کرتے ہیں ہم نے بھی عشق کیے۔ اور منافقت کی بات دوسری ہے۔ کہ لوگ کہیں کہ زندگی میں ایک ہی مرتبہ عشق ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے

اک محبت سے کہاں عمر بسر ہوتی ہے
رات لمبی ہو تو پھر ایک کہانی کم ہے

محبتوں 'دوستیوں اور "افیئرز" میں بہت فرق ہے۔ کچھ لوگوں سے تو واقعی میں نے ٹوٹ کے پیار کیا اور اسی طرح بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے مجھے بے طرح چاہا بات ذرا سی بھی اور وہ پھیل جائے تو اسکینڈل بن جاتی ہے۔

کچھ تو اُس حسن کو جانے ہے زمانہ سارا
اور کچھ بات چلی ہے مرے احباب سے بھی

○ آپ نے انگریزی شاعری بغور پڑھی تراجم بھی کیے آپ بخوبی جانتے ہیں کہ انگریزی شاعری میں غزل نام کی کوئی چیز نہیں جبکہ ہمارے سخن طرازوں کی بیشتر توانائیاں اسی صنف پر صرف ہوتی ہیں عالمی شاعری میں اردو شاعری کے نمایاں مقام حاصل نہ کرنے کا یہی سبب تو نہیں۔

○○ یہ بہت اچھا سوال ہے اور اس پر طویل گفتگو ہو سکتی ہے انگریزی زبان میں ویریکلر فارم کی سونیٹ شاعری غزل کے کافی قریب ہے لیکن وہ بھی محدود ہے اس کے بھی کچھ اصول متعین ہیں 14 مصرعوں کی نظم ہو اس کے پہلے بند میں A,B پھر B,C CD. اس ترتیب سے ہوتی ہے کچھ تجربے اس میں بھی ہوئے ہیں لیکن غزل کا پیٹرن ایسا ہے کہ اس کو آپ توڑیں تو غزل نہیں رہتی غزل کا وجود اسی میں ہے جس فریم میں وہ موجود ہوتی ہے ہمارے بہت سے ہم عصروں نے کچھ تبدیلیوں کے ساتھ بے قافیہ کی غزل کہنے کی کوشش کی لیکن بات نہیں بنی البتہ ایک صورت ہے اور یہی وجہ ہے غالباً کہ ہماری شاعری کا بیشتر سرمایہ غزل میں موجود ہے اور غزل کا ہر شعر انڈیپنڈنٹ ہوتا ہے اس کو جب ترجمہ کریں تو بہت پُرنصر ہو جاتا ہے مثال کے طور پر غالب غزل کا سب سے بڑا شاعر ہے لیکن اسے آپ کسی زبان میں ترجمہ کریں کم از کم انگریزی میں تو وہ بہت آکورڈ ہو جاتا ہے مثال کے طور آپ کہیں ۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس کا ترجمہ اگر ہم کریں تو یہی ہوگا

Oh. Foolish heart what has happen to you
what- could be the remedy of this pain

تو یہ کوئی بڑی شاعری نظر نہیں آتی دوسری زبان میں آکے غزل کا غیر مسلسل پن اس کی تلون مزاجی مثلاً پہلا شعر قفس پر دوسرا شعر مے خانے پر تیسرا شیریں فرہاد پر تو اس طرح اس کی CONTINUITY برقرار نہیں رہتی میں سمجھتا ہوں اب وہ وقت آگیا ہے کہ اگر آپ غزل کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانا چاہتے ہیں اور اسے تسلیم بھی کرانے کا عزم رکھتے ہیں تو اس کا مسلسل ہونا بہت ضروری ہے اس میں ایک تسلسل رہتا ہے Thought کا خیال کا اور جب اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو ایک مرکزی خیال جاری وساری رہتا ہے اور پڑھنے والے پر اس کا اثر ہوتا ہے کیونکہ ہم تو عادی ہو گئے ہیں لذت لیتے ہیں قافیے کی ردیف کی 'زبان کی لیکن جب اسے دوسری زبان میں منتقل کرتے ہیں تو اس کی فوقیت برقرار نہیں رہتی اس میں صرف Thought کا عنصر رہ جاتا ہے اور اس کے لیے غزل جب تک مسلسل نہ ہو تو باہر کی دنیا والے اس کو Appreciate کرسکتے ہیں نہ Enjoy کرسکتے ہیں۔

○ اچھا یہ فرمائیے۔ بحر واوزان سے ماورا شعر کہنے والے اردو شاعری کو کس سمت لے جارہے ہیں۔۔

○○ بات یہ ہے کہ میں تجربات کا مخالف ہرگز نہیں تجربات ہر زبان اور ادب میں ہوتے رہے ہیں اور ہونے بھی چاہئیں ہمارے یہاں بھی ہو رہے ہیں اس کی سب سے بڑی Test Tube ہے زمانہ اور قبول عام کوئی صنف قبول عام پالیتی ہے تو وہ رائج ہو جاتی ہے اور لوگ اس میں زیادہ لکھنے لگتے ہیں پچھلے دنوں ہمارے ہاں آزاد نظم یا Blanck Verse یا Freeverse کی لوگوں نے بڑی مخالفت کی لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اگر اچھا لکھنے والا نصیب ہو جائے کسی صنف کو تو وہ نہ صرف اس کی افادیت منوا لیتا ہے بلکہ وہ صنف باوقار ہو جاتی ہے اور اس طرح جب

Blanckverse اور Free verse کو راشد اور میرا جی جیسے بڑے لکھنے والے نصیب ہوئے تو اس کی توقیر میں اضافہ ہوا پھر موضوعات کے اعتبار سے بھی کئی ایسے موضوع ہوتے ہیں جو غزل یا نظم میں نہیں آسکتے ہمارے بزرگوں نے کبھی قصیدہ کہا کبھی مثنوی کبھی مرثیہ کہنے کے لیے انہوں نے EPICPoetry کو اور وسعت دی اور اس میں بند لائے جیسے مسدس اور مخمس یہ سارے تجربے ہی تھے لیکن آزاد شاعری یا نظم معریٰ کے لیے ضروری نہیں کہ بے وزن اور بے بحری ہو اس کی اپنی ایک بحر ہوتی ہے اس کی اپنی PUNCTUATION اور وقفے ہوتے ہیں جو شاعر وجدانی کیفیت کے تحت بیان کرتا اور تحریر میں لاتا ہے اور بڑے بڑے وسیع کینوس کے موضوعات وہ سیاسی ہوں رومانی ہوں یا المیہ ہوں اس کی وسعت کے اعتبار سے خود غالب نے کہا۔

بہ قدرے شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

تو اس کے لیے تجربے ہوتے ہیں البتہ پچھلے دنوں بات آگئی نثری نظم کی میرے خیال میں وہ نثر ہے نہ نظم کچھ سہل انگار آرام طلب لوگوں نے یا ناواقف لوگوں نے METALSCENSE نہیں ہوتا انہوں نے کچھ کوشش کیں جو ہمارے سامنے چلیں اور ہمارے سامنے ہی ختم ہوگئیں کچھ لوگ دوسری زبان کے اصناف سخن کو کاپی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں مثلاً ہائیکو میں نہیں سمجھتا کہ وہ جو تاثیر ہوتی ہے ان ہیتی تجربوں میں وہ پوری طرح بیان ہوتی ہو اس لیے یہ تجربے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔

○ آپ کے مفصل جواب سے میرے ذہن میں ایک اور سوال کلبلانے لگا رقص کو اعضاء کی شاعری کہا گیا ہے شاعری میں اعضائے رئیسہ کی بحث و تکرار کو آپ کیا نام دیں گے؟

○○ بھئی اعضائے رئیسہ تو بہت غیر شاعرانہ لفظ ہے آپ کی مراد اگر جنس سے ہے تو جنس ہماری شاعری میں ہماری کیا دنیا کی شاعری میں کہیں زیادہ پائی جاتی ہے آپ باہر کی کسی زبان میں نظم پڑھیں Love making تو بہت معمولی سا ایکسپریشن ہے اور بڑی فراوانی سے اس کا اظہار ہوتا ہے ہمارے ہاں چونکہ مشرقی روایت رہی ہیں Inhibitions اور تھوڑی بہت منافقت کہ ہم بعض باتوں کا اظہار بڑا چھپ کر کرتے ہیں حالانکہ وہ خواہش موجود بھی ہوتی ہے اور عملی زندگی میں ہم اس سے دوچار بھی ہوتے ہیں پھر کیوں کسی موضوع کو آپ شاعری کا موضوع بننے نہیں دیتے میں تو سمجھتا ہوں سلیقے سے بات کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

○ آپ کے خیال میں اردو ادب کی کون سی صنف اتنی ترقی یافتہ شکل میں ہے کہ ہم اسے عالمی پائے کی تخلیقات کے مماثل قرار دے سکیں؟

○○ میرے خیال میں Short story یعنی ہمارا افسانہ بہت ہی ترقی یافتہ ہے اور خوش قسمتی سے اسے تواتر سے بہت ہی اچھے لکھنے والے نصیب ہوتے رہے ہیں پریم چند کے بعد منٹو، کرشن، راجندر سنگھ بیدی عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، خواجہ احمد عباس، اور بہت سے لوگوں نے عالمی معیار کے افسانے لکھے۔

○ معذرت کے ساتھ آپ کی شخصیت کنٹروورشل ہونے کا سبب آپ کا کلام ہے یا ذاتی رویہ؟

○○ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آرہا ہے کسی گاؤں میں ایک لڑکی تھی جو بہت فلرٹ تھی گاؤں میں اس کے بڑے چرچے تھے چنانچہ گاؤں کے چوہدری نے اسے بازپرس کے لیے بلایا اور ڈانٹتے ہوئے کہا کہ لڑکی تو باز آجا مجھے تیری بہت شکایتیں مل رہی ہیں لڑکی نے جواب دیا چوہدری جی میں کیا کروں ایک تو گاؤں کے لڑکے بہت شرارتی ہیں دوسرے میری طبیعت لحاظ خوری ہے سو کچھ دخل میری شاعری کا بھی ہوسکتا ہے کچھ میں بھی قصوروار ٹھہرایا جاسکتا ہوں اور کچھ لوگ بھی افسانہ طراز ہوتے ہیں۔

○ شاعر تو حساس جذبوں کا امین و پیامبر ہوتا ہے۔ پھر قید خانے اور مشقتیں آپ کی زندگی میں کیوں در آئیں؟

○○ وہ جو فارسی میں کہتے ہیں

ایں ہم اندر عاشقی

اصل میں جو پرندہ آزادی کے گیت گاتا ہے وہ سب سے پہلے شکاری کے تیر کا نشانہ بنتا ہے اب وہ زمانہ تو گیا جب شاعر کا منصب غزل، نظم، یا قافیہ ردیف تک محدود ہوتا تھا عشق و عاشقی یا گل و بلبل کا زمانہ گیا جب زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں شاعر کو شعور پیدا ہوا تو اس نے اپنی ذات کے خول سے باہر نکل کر دیکھنا شروع کیا تو زندگی وسیع تر چیز تھی جس میں ہر قسم کے مسائل اور مصائب شامل تھے یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ دنیا میں جو بھی بڑا انقلاب آیا یا تصادم ہوا دو نظریات میں دو اقدار میں دو تہذیبوں میں مثلاً جہاں بھی بڑے انقلابات آئے چاہے انقلاب روس ہو یا انقلاب فرانس ہو یا ہندوستان کا انقلاب پہلے ادیب زمین ہموار کرتے ہیں مراد یہ کہ ادیب کسی بھی قوم کا شعور اور گائیڈ لائن میکر ہوتے ہیں انہیں کا لٹریچر پڑھ کر لوگوں میں آگاہی اور بیداری پیدا ہوتی ہے اجتماعی طور پر ایک دوسرے کے قریب آکر ایک نصب العین لے کر آگے بڑھتے ہیں ہم نے دیکھا دنیا بھر میں اہل قلم کو اس ابتلا سے گزرنا پڑا چاہے ترکی میں ناظم حکمت ہوں پاکستان میں فیض احمد فیض ہوں بھارت میں علی سردار جعفری یا سجاد ظہیر ہوں یا جنوبی افریقہ کے وہ رائٹر جو گولیوں کا

نشانہ بنے یا قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا ہوئے فی الوقت شاعری بازیچہ اطفال ہی نہیں دار و رسن کا کھیل بھی ہے۔

○ اپنی حد تک تو آپ اپنے قول اور کردار سے مطمئن نظر آتے ہیں کسی قسم کا کوئی پچھتاوا یا احساس جرم کا شائبہ تک نہیں آپ کے اہل خانہ اور متعلقین کا اس ضمن میں کیا تاثر ہے۔

○○ میرے خیال میں بات ہے محسوسات کی اور کمٹ منٹ کی ایک تعلق آدمی کا اپنے ماں باپ بہن بھائی اور بیوی بچوں سے ہوتا ہے جن کے سکھ کی خاطر آدمی اصولوں سے سمجھوتا کر کے خاموش تماشائی بن کر کنارے پر بیٹھا آنے والے طوفان کا منتظر رہے دوسرا گہرا اور سچا تعلق ملک قوم اور مٹی سے ہوتا ہے جن کی سرخروئی اور سربلندی کے لیے کسی بھی قیمت سے دریغ نہیں کیا جا سکتا میرے والد صاحب بھی میرے کردار سے کسی قدر شاکی تھے ابتدا میں وہ اسے شہرت کی طلب سمجھ کر مجھے تنبیہ بھی کرتے رہے ان کے خیال میں شاعر کا کام عشقیہ غزل کہنے کی حد تک ہی ہوتا ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے میرے جذبوں کی سچائی کے آگے دیوار بننا مناسب نہ سمجھا۔

احمد فراز، ناصر زیدی، کشور ناہید، آئی اے رحمان (ہالیڈے ہوٹل اسلام آباد)

○ آپ کی جلاوطنی جبری تھی یا اختیاری اس دوران اپنوں اور بیگانوں نے کس قسم کے رویے کا مظاہرہ کیا اور اس عرصے میں بننے والے افسانوں میں کتنی حقیقت تھی؟

○○ جہاں تک اس عرصے میں بننے والے افسانوں کا تعلق ہے میں ان سے قطعی طور پر لاعلم ہوں بلکہ میرا آپ سے سوال ہے کہ آپ مجھے ان افسانوں سے آگاہ کریں جہاں تک تعلق جلاوطنی کا ہے یہ اختیاری تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ جب انہوں نے پہلے مجھے سندھ سے نکالا تو مجھے اس کا دکھ ہوا کہ یہ میرا ملک ہے مجھ سے روزی چھین لی گئی کوئی بات نہیں مجھے میڈیا پر بین کر دیا گیا کوئی دکھ نہیں میری چیزیں اخبار یا رسالے چھاپنے سے معذور تھے یہ بھی کوئی بات نہیں۔ میرا ذاتی مکان گورنمنٹ نے قبضے میں لے لیا اسے بھی درگزر کیا مگر جب محاصرہ نظم پڑھنے کے جرم میں مجھے سندھ بدر کیا گیا تو مجھے بہت صدمہ ہوا کہ میں تو پہلے ہی زخم خوردہ شہری ہوں میرے عظیم الشان وطن کے بڑے حصے کو الگ کر کے مجھے نسبتاً چھوٹے ملک کا شہری بنا دیا گیا۔ اور اب میں اس میں بھی گھوم پھر نہیں سکتا نہ ٹی وی پر مشاعرہ پڑھ سکتا ہوں نہ ریڈیو سے مذاکرہ میں حصہ لے سکتا ہوں نہ کسی اخبار میں چھپ سکتا

ہوں آج مجھ پر سندھ جانے پر پابندی لگی ہے کل کلاں کو پنجاب یا میرے اپنے آبائی گاؤں جانے پر بھی پابندی لگ جائے تو کیا بعید ہے کیا میں وقت کا نیرو بن کر بانسری بجانے لگتا یا کسی کوٹھری میں بند ہو کر اپنے احتجاج رقم کر کے گھڑے میں ڈالتا رہتا اور آنے والے وقت پر ان کو میڈل کی طرح سینے پر سجا کر فخریہ اعلان کرتا کہ دیکھو میری احتجاجی شاعری اور مجھے داد دو نہیں صاحب یہ تو کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کوئی بھی زندہ و بیدار شخص وقت کے دھارے خلاف کیسے چل سکتا ہے مجھے تو اپنے پسے ہوئے لوگوں کی آواز بن کر ہر شکل میں بلند ہونا تھا میں نے اپنے دوسرے ہم عصروں کی مانند وقت کے جابر حکمرانوں سے راہ و رسم پیدا کرنے اور انعام و اعزاز حاصل کرنے کی نسبت جلاوطنی کو بہتر جانا میرا ضمیر اس وقت بھی مطمئن تھا اور آج بھی مسرور ہے۔

○ آپ مجھ سے سوال کرنا چاہتے تھے اگر آپ ملکی و غیر ملکی دوستوں کا رویہ بیان کریں تو جواب اس میں پوشیدہ ہے؟

○○ جانے دیجئے کیوں کسی کی عیب جوئی کراتے ہیں بس اتنا عرض کروں گا کہ اس کڑے وقت میں دوستوں کی ایک تعداد نے اجنبیت اختیار کر لی اور دوسری معقول تعداد نے دشمنوں کی صفوں میں شمولیت اختیار کر کے انھیں کے تیر آزمانا شروع کر دیے محبت، حوصلہ اور رہنمائی اجنبی دوستوں سے ملی جنھوں نے دنیا کے گوشے گوشے سے مجھے دعوتوں اور استقبالیوں سے نوازا میں آج بھی ان اجنبی دوستوں کا ممنون احسان ہوں۔

○ جلاوطنی کے دوران ظاہر ہے مشق سخن جاری رہی ہوگی آپ اپنے قاری تک کس ذریعے سے اسے پہنچاتے رہے؟

○○ دیکھئے اس دوران بیرون ملک سے میرے دو مجموعے چھپے "نابینا شہر میں آئینہ" "بے آواز گلی کوچوں میں" جن سے خلا کر پر کرنے میں خاصی مدد ملی اس سے بھی زیادہ میری غیر حاضری یا غیر موجودگی کو میرے بیرون ملک ریکارڈ شدہ کیسٹس نے پورا کیا ان کی اہمیت کا اندازہ مجھے وطن واپسی پر ہوا جب بے شمار دوستوں کی تحویل میں میں نے ان کیسٹوں کو دیکھا اور اس طرح میرے چاہنے والوں تک میری آواز میرے شعر پہنچتے رہے۔

○ آپ کے خیال میں وطن سے باہر پاکستانی تخلیق کاروں کی پذیرائی کا پیمانہ کیا ہے؟

○○ دیکھیے ایک پیمانہ تو لوگوں کا ذوق ہے جس کے تحت مشاعرے برپا کیے جاتے ہیں جس میں ہندوستان پاکستان کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک سے بھی شعرا مدعو کیے جاتے ہیں میں کسی تعلّی یا خود ستائشی جذبے سے ماورا ہو کر بیان کروں کہ لوگوں نے میری شاعری کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر میری پذیرائی کی اور میرے اعزاز میں خصوصی محفلوں کا انعقاد بھی کیا یہ آزمائش کا وقت تھا جس میں تلخ تجربوں کے ساتھ مجھے بیش بہا محبتیں بھی ملیں۔

○ تیسری دنیا کے حکومتی ایوانوں میں رائج تخلیق کاروں کی پذیرائی کے طریقہ کار کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

○○ تیسری دنیا میں حکومتوں کی مختلف شکلیں ہیں کہیں بادشاہت ہے کہیں آمریت ہے اور کہیں جمہوریت میرا خیال ہے آپ کی مراد ڈکٹیٹر شپ سے ہے جہاں ظاہر ہے ماحول گھٹن زدہ ہوتا ہے لوگ گفتگو بھی محتاط کرتے ہیں۔ تخلیق کاروں کا اجتماع بھی حکومت کو کھٹکتا ہے بعض مواقعوں اور جگہوں پر اجتماعات کی اجازت بھی نہیں ہوتی ظاہری بات ہے کہ جو شاعر اس ماحول میں آزادی کی بات کرے گا حریت کی بات کرے گا حقوق کی بات کرے گا انسانی قدروں کی بات کرے گا۔ اس کی پذیرائی بقدر ظرف جیل قید کوڑے کی شکل میں کی جاتی ہے اور جو قصیدہ گوئی، سحربیانی، مداح سرائی کے گیت الاپنے کے ساتھ انھیں مسیحائے وقت گردانیں گے انھیں ان کی اوقات کے مطابق مال و زر میں لپٹے انعام و اعزاز سے نوازا جائے گا جس سے ان کا وقتی طور تو شاید نمایاں ہوتا ہو گر آنے والا وقت ان کے لیے گم نامی کے اندھیروں کے سوا کچھ نہیں لاتا۔

○ فراز صاحب کیا ترقی پسندی واقعی مذہب سے متصادم ہے اس تحریک نے سیاست اور معاشرت کے علاوہ ادب اور ادیب کو تقسیم در تقسیم نہیں کیا نیز اس نظریے کا ماضی اور حال تو ہمارے علم میں ہے مستقبل کے بارے میں آپ کیا حسن ظن رکھتے ہیں؟

○○ میں اپنے ملک کے حوالے سے بات کرنا چاہوں گا۔ کہ جب یہاں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ہوئی تو اس وقت ہمارا پورا منظر نامہ امریکہ کے زیر اثر تھا نیٹو اور سینٹو کے معاہدوں کے تحت امریکہ ہر قسم کی معاشی آواز اور تحریک کو دبانے کے درپے تھا اسی کے ایجنٹ اور گماشتے ہمارے ملک میں کام کر رہے تھے چنانچہ جس نے بھی اقتصادی ناہمواری کے خلاف آواز اٹھائی اسے کیمونسٹ بے دین اور لامذہب کہا جانے لگتا یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جاتا کچھ فائدہ انھیں عوام کی جہالت کا بھی پہنچا کم علم مولوی کو بھی اس ضمن میں استعمال کرتے ہوئے ہم لوگوں کو خدا اور رسول کا منکر ٹھہرایا گیا حالانکہ ترقی پسند تحریک کا دین سے مثبت یا منفی کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا ہم لوگ جتنے مسلمان اس تحریک میں شمولیت سے پہلے تھے بفضل خدا اتنے ہی آج بھی ہیں ترقی پسند ادبی تحریک تھی جس کے شرکاء کو پڑھا لکھا ہونے کے باعث سیاسی شعور بھی تھا دیکھئے سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ کم علم

مُلاؤں نے اسلام کو ہوا بنا کر رکھ دیا ہے حالانکہ اسلام عدل، اور رواداری کا دین ہے جس میں سب سے زیادہ زور حقوق العباد پر دیا گیا ہے مثال کے طور پہ ایک سمگلر ذخیرہ اندوز بلیک میلر منشیات فروش اگر نماز پڑھتا ہے تو اس کا کیا فائدہ آپ خود سوچیئے پہلے اس کا ان قبیح فعلوں سے تائب ہونا ضروری ہے یا نماز پڑھنا ضروری اب اگر ایک پڑھا لکھا باشعور ترقی پسند جبر کے خلاف زیادتی کے خلاف ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو ملحد ٹھہرا دیا جاتا ہے چونکہ وہ انصاف پسند ہے یقین مانیے کیمونسٹ یا سوشلسٹ ہونا کسی طرح بھی مذہب سے منکر ہونے کے مترادف نہیں بلکہ وسائل کی بندر بانٹ کے خلاف ایک موثر آواز ہے جس سے غریب کو بیدار کر کے باشعور بنایا جاسکتا ہے اور ایک باشعور فرد ہی بہتر مذہبی انسان بھی بن سکتا ہے جہاں تک سوال مستقبل کا ہے تو اس سلسلے میں یہ عرض کروں گا کہ آپ کوئی بھی تجربہ کیجئے ابتدا میں اس کی ناہمواری اور کھُردرا پن آپکے لیے دشواری کا باعث بھی بن سکتا ہے جسطرح آپ نے پہلی بار کثافتوں سے آلودپانی پیا یا خدشات سے پُر ریل اور ہوائی جہاز میں سفر کیا قیمتی جانوں کی قربانی دے کر صاف پانی میسر آیا یا محفوظ سفر میسر ہوا اسی طرح وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس نظام کی خامیاں بھی دور ہوں گی روسی نظام میں یقینا کچھ خامیاں ہوں گی جس کے باعث وہ وقتی طور پر فلاپ ہوا یہ نظام کی نہیں لیبارٹری کی ناکامی ہے یہ ایک فلاسفی ہے ایک فکر ہے جو زندہ تھی اور زندہ رہے گی۔

○ ترقی پسند تحریک میں کچھ لوگ شدت پسند تھے کچھ معتدل مزاج کیا یہ تفاوت شخصیات کے ٹکراؤ کے باعث پیدا ہوا اگر نہیں تو صحیح صورت حال کیا ہے اور آپ کا شمار کس طرف کے لوگوں میں ہوتا ہے؟

○○ دیکھئے تین قسم کے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں شدت پسند معتدل مزاج اور دھیمی طبعیت کے مالک ہماری مذہبی جماعتوں میں بھی اس قسم کے متضاد خیال لوگ نظر آئیں گے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر سطح پر شخصیات کا ٹکراؤ ہی ہو پروگرام پر اختلاف ہو سکتا ہے اس کی رفتار پر اختلاف ہو سکتا ہے اس کے مزاج پر اختلاف ہو سکتا ہے اب دیکھئے میں اور فیض صاحب ایک نظریے ایک سوچ اور ایک عصر کے آدمی تھے فیض صاحب انتہائی دھیمی طبعیت کے مالک درگزر کرنے والے انسان تھے اور میں بہت جلد ری ایکٹ کرنے والا آدمی ہوں بات ہے احساسات کی اب اگر منٹو اور راشد کو تحریک سے الگ کیا گیا تو یہ ان کی عظمت کا انکار نہیں ان سے اختلاف کا مظہر ہے کیونکہ ایک دنیا ان کے قلم کی معترف ہے جن میں میں بھی شامل ہوں جہاں تک سوال کے اس حصے کا تعلق ہے کہ میرا شمار کس صف میں ہوتا تھا تو اس کا جواب اگر میرے دوستوں سے پوچھا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔

○ نیشنل سینٹر اکادمی ادبیات اور لوک ورثہ کی سربراہی سے بار بار کی برطرفی ہمارے خیال میں آپ جیسے قومی اور بین الاقوامی شہرت کے حامل بلند پایہ دانشور اور شاعر کی توہین کے مترادف ہے ان تلخ تجربات کے باوجود بھی آپ نے نیشنل بک فاؤنڈیشن کی سربراہی کیونکر قبول کی؟

○○ یہ بہت دلچسپ بات ہے آپ کی طرح میرے اور بھی بہت سے دوست اکثر اس بات پر برہم ہوا کرتے ہیں کہ میں بار بار کی توہین کے بعد کیوں کوئی منصب قبول کرلیتا ہوں دیکھئے بات اگر ہوتی انفرادی سوچ کی یعنی معاملہ اگر میری ذات کا ہو پھر تو آپ کا استدلال درست ہے لیکن جہاں معاملہ اجتماعی سوچ فکر پروگرام اور نظریات کا ہو وہاں جذبات سے بالاتر ہو کر فیصلے کرنا پڑتے ہیں میں یا میرے نظریات کے حامل لوگ اپنی ذاتی انا اور وقار کی خاطر ذمہ داریاں نبھانے سے کترانے لگیں تو ہماری ان کرسیوں پر ہمارے پروگرام ہماری فکر کے مخالفین ہی بیٹھیں گے ہو سکتا ہے ہماری نسبت وہ اپنی سوچ اور فکر میں زیادہ شدت پسند ہوں اور اس قسم کے فیصلے کریں جو ملک اور قوم کے لیے کس قدر نقصان دہ ہوں اب اگر مجھے یہاں بٹھایا گیا ہے تو میری پوری ذمہ داری ہے کہ میں ایسی کتب کا انتخاب چھاپوں جو ہر طرح سے ملک اور قوم کے لیے ترقی اور بہتری کا باعث بنے مجھے پھر سے فیض صاحب یاد آرہے ہیں وہ کہا کرتے تھے کہ پسے ہوئے عوام کو ان کے حقوق دلانے کے لیے پڑھے لکھے لوگوں کو فوج، پولیس، اور انٹیلی جنس میں بھی شامل ہونا چاہیے۔

○ آدھی صدی عمر ہو چلی ہمارے وطن کی کتنے شاعر ادیب ایسے ہیں جنہوں نے عالمی ادب میں قابل ذکر مقام حاصل کیا؟

○○ لفظ قابل ذکر استعمال کر کے آپ نے میری مشکل آسان کر دی اب میں وہی نام گنواؤں گا جن کا ذکر ضروری ہو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ حصہ تو علامہ اقبال کا ہے اس کے بعد فیض صاحب کا ہے کسی قدر جوش صاحب کا بھی ذکر پایا جاتا ہے احمد ندیم قاسمی صاحب کے افسانے اور نظموں کے بہت سی زبانوں میں تراجم ہوئے اور شاید کچھ حصہ اس ناچیز کا بھی ہو۔

○ آپ اپنے فنی سفر کے کس مرحلے میں خود کو محسوس کرتے ہیں؟

○○ میرا خیال ہے ابتدائی مرحلے میں ہوں جو کچھ لکھا اس سے مطمئن نہیں مطمئن ہوتا تو شاید اس کی درجہ بندی کر سکتا بعض اوقات کوئی لائن لکھتا ہوں تو جذباتی طور پر خود کو نوآموز محسوس کرتا ہوں لیکن میں کسی بڑے موضوع کی جستجو میں ہوں ایک بہت طویل نظم لکھنا چاہتا ہوں شاید لکھی بھی جائے مستقل مزاج نہیں ہوں ٹک کر بیٹھنا میرا شیوہ نہیں اور یہ کام جو ہے۔ بہت ہی صبر اور حوصلے کی بات ہے دیکھیے شاید کوئی ایسی چیز لکھ پاؤں جس سے میں کہوں کہ ہاں میں نے کچھ لکھا ہے۔

○ زندگی کا سب سے بڑا پچھتاوا سب بڑی خوشی اور سب سے بڑی آرزو؟

○○ والدہ کی جتنی خدمت کرنا چاہئے تھی وہ نہیں کر سکا یہ احساس رہتا تھا پھر ایک مشاعرہ ہوا اسلام آباد میں فیض صاحب کی یاد میں لوک ورثہ میں وہاں میں نے "محاصرہ" نظم پڑھی تو ایک بوڑھی خاتون نے کہا "بیٹا اس ماں کو سلام جس نے تمہیں جنم دیا۔ یہ میرے لئے بڑی کا خوشی مقام تھا----!

انسان بڑا غیر مطمئن حیوان ناطق ہے ایک آرزو پوری ہوتی نہیں کہ اس کے ساتھ ہی ایک اور آرزو جنم لے لیتی ہے

بقول علامہ اقبال

ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بنا لیتی ہے تصویریں

○ انٹرویو کے آخر میں پیغام کی روایت تو بہت فرسودہ ہوئی اپنے محبت کرنے والوں سے اپنی پسند کے اختتامی کلمات کہہ دیجئے

○○ بھئی بات یہ ہے کہ نصیحت تو ہم کرتے نہیں، نہ ہم نے کسی کی سنی دیانت داری کے ساتھ اپنے آپ سے جو بھی سلوک کریں لیکن جہاں اپنے وطن اور اپنے لوگوں کے وقار یا ان کی آبرو کا سوال ہو وہاں چاہے اپنے ہی لوگوں سے آپ کو نبرد آزما ہونا پڑے اس سے دریغ نہ کریں کیونکہ جس چیز کو آپ سچ سمجھیں اس کو پھر سچائی کے ساتھ آگے بڑھائیں۔

* * *

احمد فراز محترمہ کنیز یوسف اور اصغر خاں

فیض صاحب اور میں

اس میں تو دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ فیض صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے شاعر تھے اور ہر بڑا شاعر نہ صرف اپنے جونیئر کو بلکہ اپنے ہم عصروں کو بھی متاثر کرتا ہے بعد کی نسل کے شاعر تو ایک طرف ان کے ایج گروپ کے لوگ جن میں علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی تک شامل ہیں ان کے اسلوب اور ڈکشن سے تھوڑے بہت متاثر نظر آتے ہیں میں نے جس عہد میں شاعری شروع کی اس وقت فیض، ندیم، ن۔ م۔ راشد اور ساحر لدھیانوی بڑے شاعر تسلیم کئے جا چکے تھے احمد ندیم قاسمی صاحب سے شروع ہی میں رغبت پیدا ہو گئی تھی ان کی شخصیت جاذبیت رکھتی تھی اور ان کا کلام ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھا کرتے تھے بلکہ جب ان کی کتاب جلال و جمال چھپ کر آئی تو میں طالب علم تھا اور ساڑھے سات روپے کی کتاب خرید نہیں سکتا تھا چنانچہ میں نے اور میرے ایک درست نے آدھی آدھی رقم اکٹھی کی اور جلال و جمال خریدی۔ راشد صاحب سے بھی مجھے ریڈیو کے زمانے میں قربت ہو گئی تھی۔

لیکن ان کا مزاج بالکل مختلف تھا وہ ہمارے افسر تھے اس لیے ان کی شخصیت سے محبت کی بجائے میں زیادہ مرعوب تھا پھر ان کی شاعری اس زمانے میں ہماری سمجھ سے بالاتر تھی سوائے چند سیدھی سادی نظموں کے باقی تخلیقات معمہ لگتی تھیں' اسی دوران میں فیض صاحب کا ایک شعر چھپا۔

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھّو سر بالیں کوئی خورشید اب کے

یہ مشکل زمین تھی لیکن میں نے اس پر غزل کہی اس کا آخری شعر تھا۔

ہم نے یہ سوچ کے جاں دی ہے محبت میں فرازؔ
بوالہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اب کے

اور یہ سات 7 شعروں کی غزل جب چھپی تو بعض دوستوں نے بہت سراہا۔ پھر ایسا ہوا کہ فیض صاحب کی جو غزل شائع ہوتی اس پر میں طبع آزمائی کرتا اس طرح

احمد فراز

کوئی چار چھ غزلیں فیض صاحب کی زمینوں میں کہیں فیض صاحب کو ساحر صدیقی مرحوم نے "تقلید اب کے" اور "تردید اب کے والی" غزل سنائی اور کہا کہ فیض صاحب آپ کا کیا خیال ہے؟ اس غزل کے بارے میں تو فیض صاحب نے کہا کہ یہ زمین میری ہے مگر غزل فراز نے عمدہ کہی ہے پھر فیض صاحب سے پہلی ملاقات میری اس وقت ہوئی جب وہ ہری پور ایک مشاعرے میں آئے غالباً یہ اقبال ڈے تھا۔ فیض صاحب نے اپنے شعر سنانے سے پہلے اقبال کے شعروں کی تشریح کی غالباً غزل یہ تھی۔

ہوس چھُپ چھُپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

انکی تقریر اور تفسیر سے میں خاصا متاثر ہوا انھوں نے اقبال کی اس غزل کے نئے پہلو اجاگر کئے تھے پھر فیض صاحب سے میری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ماہنامہ "اشتیاق" پشاور کا ایڈیٹر ہوا اور رسالے کے لیے مواد جمع کرنے کے سلسلے میں لاہور ان کی اقامت گاہ پر پہنچا۔ فیض صاحب نے ہمیں کافی پلائی غالباً وہ کچھ ہی دن پہلے جیل سے رہا ہو کر آئے تھے انھوں نے میرے اصرار پر ایک غزل لکھ کر دی جو بد قسمتی سے نہ ان کے کسی مجموعے میں ہے اور نہ ہی اس کا کوئی شعر مجھے یاد ہے اور نہ ہی "اشتیاق" کا وہ شمارہ موجود ہے جس میں وہ شائع ہوئی تھی پھر جب میرا پہلا مجموعہ "تنہا تنہا" اشاعت کے لیے تیار ہوا تو میں نے فیض صاحب سے کچھ لکھنے کی استدعا کی اور انھوں نے فلیپ لکھا۔ مگر فیض صاحب سے زیادہ قربت اس وقت نصیب ہوئی جب وہ بھٹو صاحب کی حکومت میں ثقافت کے مشیر ہوئے اکثر دوستوں کی دعوتوں میں ہم یکجا ہوئے کبھی کبھی میرے گھر پر بھی ایسے اجتماع ہوتے تھے اس دوران ماہنامہ "دھنک" لاہور نے "میرا پسندیدہ شاعر" گلوکار مصور وغیرہ کے سلسلے میں سروے کیا اور قارئین کو اپنے پسند کی دعوت دی شروع

شروع میں تو بہت سے لوگ اس فہرست میں جمع تھے لیکن رفتہ رفتہ ان کے پسند کرنے والوں کی تعداد کم ہوتی گئی اور آخر میں فیض صاحب اور میں ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے لیکن فائنل رزلٹ میں مجھے پسند کرنے والوں نے سبقت حاصل کر لی اور "دھنک ایوارڈ" کا حقدار مجھے ٹھہرایا گیا اس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ میں فیض صاحب سے کسی صورت بھی بڑا شاعر ہوں لیکن صرف لوگوں کی پسند کی بات ہے چنانچہ ایک مرتبہ فیض صاحب اور میں ایک صاحب کے گھر مدعو تھے تو صاحب خانہ نے اپنے بچوں سے تعارف کراتے ہوئے کہا "یہ فیض صاحب ہیں پاکستان کے نمبرون شاعر ہیں اور یہ احمد فراز' پاکستان کے نمبر دو شاعر------؟""

فیض صاحب نے فورا ٹوکا اور کمال شفقت و مہربانی سے کہا۔ نہیں بھئی آجکل فراز نمبرون ہے------- بہرحال انکا فیض ہمیشہ جاری رہا۔ پھر زیادہ ان کی قربتوں کا موقع اس وقت میسر آیا جب میں جلاوطنی کے زمانے میں لندن تھا تو فیض صاحب بیروت سے لندن آئے ان دنوں کچھ دوستوں کا خیال تھا کہ فیض صاحب پر فلم بنائی جائے جس کا سکرپٹ مجھے لکھنا تھا چنانچہ فیض صاحب ساڑھے نو بجے جب نہا دھو کے سوٹ ٹائی پہن کے ناشتے کی میز سے اٹھتے تو ہم انٹرویو میں مصروف ہو جاتے میں نے ان کے کوئی بیس 20 پچیس 25 کیسٹ تیار کیے مسز علی جبلو کے نام سے دوستوں میں مقبول تھیں انھوں نے کچھ تھوڑی بہت مووی کیمرے سے فلم بھی تیار کی لیکن یہ قربت محض دو ماہ تک رہ سکی پھر ہم مختلف ممالک میں کچھ عرصہ ساتھ رہے لیکن بعد میں وہ ویت نام چلے گئے اور میں امریکہ اور ہمارا رابطہ تقریباً منقطع ہو گیا۔

فیض صاحب کی شخصیت اس اعتبار سے مجھے زیادہ عزیز ہے کہ ان میں میں نے کبھی غرور تو کیا افتخار کا عنصر بھی نہیں دیکھا بے پناہ علم اور جوہر کے باوجود وہ ہمیشہ انکسار اور عجز سے کام لیتے میں نے ان سے مختلف موضوعات پر گفتگو کی اور ہر موضوع پر نہ صرف یہ کہ وہ علم رکھتے تھے بلکہ "کلیئر ہیڈڈ" تھے وہ کبھی دقیق سے دقیق مسئلے پر بھی کہیں "کنفیوژن" کے شکار نہیں ہوتے تھے ان سے زیادہ قربت اور خاص طور پر ابتدا میں جو میں نے ان کی زمینوں میں کچھ غزلیں کہیں تو بعض نقادوں نے میری شاعری کو فیض صاحب کا عکس قرار دیا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میں ان کی شاعری سے اور شخصیت سے متاثر نہیں تھا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ہم ایک ہی زمانے میں اور نظریاتی طور پر بھی ہم آہنگ تھے اس لیے بہت سے موضوعات مشترک ہو گئے البتہ نہ صرف یہ کہ میرے تجربے اور موضوعات اپنے تھے اور میں نے اپنے ہی انداز میں انھیں منظوم کیا خاص طور پر میری غزل تو فیض صاحب سے بے حد مختلف ہے۔

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ فیض صاحب نہ صرف ہمارے زمانے کے ہی بہت بڑے شاعر تھے بلکہ آئندہ زمانے میں بھی ان کا مقام امتیازی حیثیت رکھے گا۔

شعر و نغمہ---احمد فراز اور ملکہ ترنم نور جہاں

فراز کی شاعری کے انگریزی تراجم

فیض احمد فیض ترجمہ: جاوید احمد

کچھ دوسرے مشرقی لٹریچرز کے برعکس دونوں کلاسیکی اور جدید اردو زبان و ادب کی مغرب میں بہت کم پہچان ہے شاید مغرب میں جانے پہچانے جانے والے واحد اردو پاکستانی شاعر کم از کم پڑھے لکھے حلقوں میں صرف علامہ اقبال ہیں علامہ اقبال جنہیں اہل وطن نہایت ادب سے عظیم مفکر کہتے ہیں لیکن اقبال کو بھی سب سے پہلے جس وجہ سے توجہ حاصل ہوئی وہ ان کی اردو شاعری کی بجائے فارسی شاعری اور جمالیاتی کشش کی بجائے نظریاتی نقطہ نظر تھا۔ اس سرد مہری کی ایک وجہ تو سامنے ہے کہ سنسکرت فارسی اور عربی کے مقابلے میں اردو ابھی نو عمر ہے اسے گزشتہ دو یا تین صدیوں سے استحکام ملا۔ اس لیے اس کے روایتی ورثے کو زیادہ فروغ حاصل نہیں ہو سکا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو زبان اور خاص طور سے اس کی شاعری کے دبستان کو جس دور میں عروج حاصل ہوا اور جس سرزمین پر ہوا وہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں تاراج ہوتی رہی انہوں نے اپنے مطلوبہ شعبوں کو چلانے کے لیے زبان و ادب پر اپنی ثقافتی حاکمیت برقرار رکھی جو کہ ان کا مخصوص وکٹورین انداز تھا اس طرح کے میل ملاپ سے فطری طور پر ایک تحقیر و انفعالیت کا پیدا ہونا لازمی تھا البتہ یہ ایک گزرے دور کی تاریخ ہے اور اب وقت ہے کہ ابلاغ کی سطح پر اس دوری کو ختم کیا جائے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اردو آج ایک پوری طرح ترقی یافتہ زبان ہے اور اس کا ادبی محاورہ پاکستان اور ہندوستان کے تقریباً سبھی حصوں میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ سمجھتے اور بولتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے ادب کا اور خصوصاً شاعری کا مطالعہ وہ لوگ سب پسندیدگی سے کرتے ہیں جو پاکستانی یا ہندوستانی ہیں اور یورپ میں آباد ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جن ترقی یافتہ ادیبوں نے اس کی پرورش میں حصہ لیا تھا یہ ان سے آگے نکل گئی اور اس نے آخری چار یا پانچ دہائیوں میں نظم اور نثر دونوں میں باصلاحیت لکھنے والوں کی ایک پوری کھیپ تیار کی اس کھیپ میں ایک معروف اور ممتاز نام احمد فراز کا ہے فراز نے شاعری کا آغاز کلاسیکی انداز کی غزل گوئی سے کیا اور اپنے لیے اسے ذریعہ اظہار بنایا۔ غزل جو کہ اظہار کے لیے ایک قدیم روایت رکھنے والی سہل اور پرجوش صنف ہے سہل اس لیے کہ شاعر کو تعداد میں تمثال کاری علامتوں اور استعاروں کا ایک تیار مجموعہ دیتی ہے جو اردو اور فارسی کے گرانقدر اساتذہ کی دین ہے شاعر اس پر عبور حاصل کر کے اپنے انداز میں برتتا ہے اسی وجہ سے یہ صنف اپنے اندر ایک پہچانی کیفیت لیے ہوئے ہے کیونکہ شاعری میں کوئی الگ مقام یا پہچان بنانے کے لیے یہ شاعر سے غیر معمولی شدت

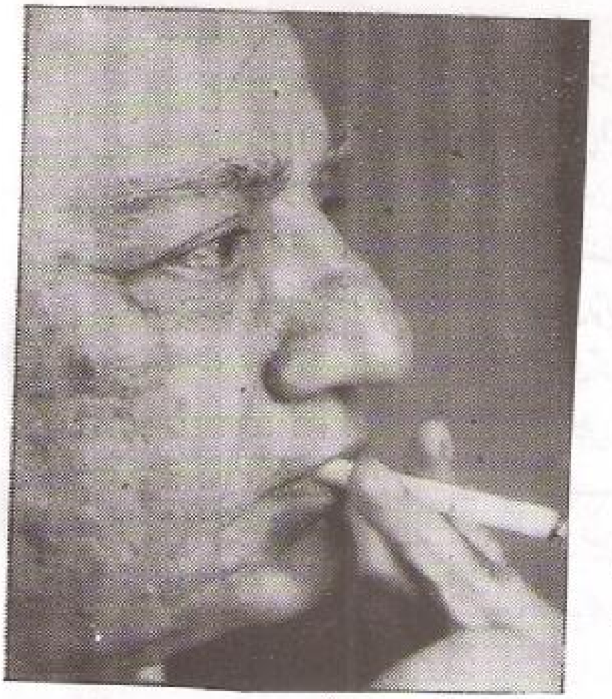

احساس اور ماہرانہ اظہار کا مطالبہ کرتی ہے۔ فراز کی محبت کے موضوع پر کہی ہوئی نظمیں اور غزلیں ان دونوں خصوصیات کی حامل تھیں اور ہیں اس انداز نے فراز کو بہت جلد شہرت اور ہر دلعزیزی عطا کی۔ خاص طور پر نوجوانوں نے اس کی شاعری کے اس حصے کو اپنے دل کی دھڑکنیں خیال کیا فراز اپنے گرد و پیش کے فوری سماجی حقائق کے حوالے سے بہت زیادہ حساس شاعر ہے دل شکنی دکھ، جبر، تحسین، غم و غصہ امید و یاس کا پروردہ ایک خوفناک سماجی نظام جس کا انسان شکار ہے ایک باشعور ذہن رکھنے والے آدمی کے لیے یہ خارجی حقائق ایک داخلی تجربہ بن جاتے ہیں یہ سارا مواد ہے جس سے فراز کی شاعری کی تشکیل ہوئی۔ اس کتاب میں اس کی نمائندگی ہوتی ہے۔

وہ ناانصافی کے خلاف احتجاج اس صبر و تحمل سے کرتا ہے جیسا کہ محبت میں اس کا انداز ہے البتہ بعض اوقات اس کا لہجہ ذرا سخت اور اظہار پرجوش ہو جاتا ہے۔ لیکن شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا فراز نے جو کلاسیکی شاعری کا زبان و محاورہ استعمال کیا وہ خاص طور سے ہماری مشرقی جاگیرداری روایت کی علامات سے مزین معانی میں کثیرالسطحی اور دیکھنے میں سادہ الفاظ کا استعمال ہے۔ جیسا کہ ہماری شاعری میں عام طور سے ہوتا ہے لیکن یہ ترجمہ کرنے والے کو ناقابل حل مشکلات کے ساتھ ایک اور طرح کی زبان لگتا ہے۔ خاص طور پر جب زبان کو مشرقی روایات سے اس طرح الگ کر کے دیکھا جائے جیسا کہ انگریزی کے سلسلے میں ہے۔ اس مجموعے کا ترجمہ ان مسائل کے ساتھ بڑی جانفشانی اور انہماک سے نمٹا ہے اور مجھے امید ہے کہ اردو و انگریزی ترجمے کی لائبریری کے لیے ایک سودمند ایڈیشن ثابت ہوگا۔

احمد فراز کی شاعری --- ایک مختصر تاثر

احمد ندیم قاسمی

چند ہفتے پہلے کا واقعہ ہے کہ احمد فراز، امجد اسلام امجد، سجاد بابر اور میں عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لیے احرام باندھے مکہ مکرمہ پہنچے۔ ہم طواف کعبہ مکمل کر چکے اور سعی کے لیے صفا و مروہ کا رخ کرنے والے تھے کہ ایک خاتون لپک کر آئی اور احمد فراز کو بصد شوق مخاطب کیا۔ ”آپ احمد فراز صاحب ہیں نا؟“ فراز نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولی۔ ”ذرا سا رکیے گا۔ میرے بابا جان کو آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔“ وہ گئی اور ایک نہایت بوڑھے بزرگ کا بازو تھامے انھیں فراز کے سامنے لے آئی۔ بزرگ اتنے معمر تھے کہ بہت دشواری سے چل رہے تھے مگر ان کا چہرہ عقیدت کے مارے سرخ ہو رہا تھا اور ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے، بولے۔ ”سبحان اللہ یہ کتنا بڑا کرم ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے اپنے ہی گھر میں مجھے احمد فراز صاحب سے ملوا دیا --- وہ احمد فراز جو میرے محبوب شاعر ہیں اور جنھوں نے میر و غالب کی روایت کو توانائی بخشی ہے۔“ عقیدت کے سلسلے میں انھوں نے اور بہت کچھ کہا اور جب ہم ان سے اجازت لے کر سعی کے لیے بڑھے تو میں نے فراز سے کہا۔ ”آج آپ کی شاعری پر سب سے بڑے الزام کا ثبوت مل گیا ہے۔“ سب نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ”دیکھا نہیں آپ نے۔ یہ ”ٹین ایجر“ فراز سے کتنی فریفتگی کا اظہار کر رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ٹین ایجر کی عمر اسّی بیاسی سے متجاوز تھی۔“

”فراز ٹین ایجرز کا شاعر ہے۔“ --- فراز صرف عنفوان شباب میں داخل ہونے والوں کا شاعر ہے۔ ”----“ فراز کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان طلبہ کا شاعر ہے اور بس ----- فراز پر یہ الزامات ہر طرف سے وارد ہوتے رہے ہیں مگر وہ اس گھٹیا الزام تراشی سے بے نیاز، نہایت خوب صورت شاعری تخلیق کیے جا رہا ہے۔ اگر حسن و جمال اور عشق و محبت کی اعلیٰ درجے کی شاعری گھٹیا ہوتی تو میر اور غالب، بلکہ دنیا بھر کے عظیم شاعروں کے ہاں گھٹیا شاعری کے انباروں کے سوا اور کیا ہوتا۔ فراز کی شاعری میں بیشتر یقیناً حسن و عشق ہی کی کارفرمائیاں ہیں اور یہ وہ موضوع ہے جو انسانی زندگی سے خارج ہو جائے تو انسان کے باطن صحراؤں میں بدل جائیں، مگر فراز تو بھرپور زندگی کا شاعر ہے۔ وہ انسان کے بنیادی جذبوں کے علاوہ اس آشوب کا بھی شاعر ہے جو پوری انسانی زندگی کو محیط کیے ہوئے ہے۔ اس نے جہاں انسان کی محرومیوں، مظلومیتوں، اور شکستوں کو اپنی غزل و نظم کا موضوع بنایا ہے، وہیں ظلم و جبر کے عناصر اور آمریت و مطلق العنانی پر بھی ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے اور اس سلسلے میں غزل کا ایسا ایسا شعر کہا ہے اور ایسی ایسی نظم لکھی ہے کہ پڑھتے یا سنتے ہوئے اس کے مداحین جھومتے ہیں اور اس کے معترضین کے منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں۔ یہ دونوں پہلو زندگی کی حقیقت کے پہلو ہیں اور حقیقت ناقابل تقسیم ہوتی ہے۔

ایک بار ایک معروف شاعر نے چند دوسرے ہر دلعزیز شعراء کے علاوہ احمد فراز پر بھی تک بندی کا الزام عائد کر دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ شاعر اگر احمد فراز کا سا ایک شعر بھی کہہ لیتے تو اس احساس کمتری کا مظاہرہ کرنے کا تکلف نہ فرماتے۔ مثال کے طور پر فراز کے صرف دو شعر دیکھیے۔ اگر یہ تک بندی ہے تو نہ جانے اعلیٰ معیار کی شاعری کسے کہتے ہیں۔

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں
آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اور کچھ ایسے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہی

میں صرف ان دو شعروں کے حوالے سے کہوں گا کہ جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں تو مجھے ان میں پوری فارسی اور اردو غزل کی دل آویز روایات گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔

احمد فراز کے والد مرحوم اردو کے علاوہ فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ پھر فراز کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہوئی جہاں بیدل، سعدی، حافظ، عرفی، نظیری اور غالب کی فارسی شاعری کے چرچے رہتے تھے۔ کوہاٹ اور پشاور میں اردو شاعری کا ایک بھرپور ماحول پیدا ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد فراز کی غزل دراصل صنف غزل کی تمام روشن روایات کے جدید اور سلیقہ مندانہ اظہار کا نام ہے۔ اس کا ایک ایک مصرع ایسا گٹھا ہوا ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک لفظ کی تبدیلی کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ اور چونکہ فراز کی غزل تکمیل (PERFECTION) کی انتہا ہے اس لیے جب وہ نظم کہتا ہے، تو اس کی بھی اک ایک لائن برجستہ اور بے ساختہ ہوتی ہے۔ چنانچہ احمد فراز غزل اور نظم کا ایسا شاعر ہے جو دورِ حاضر کے چند گنے چنے معتبر ترین شعراء میں شمار ہوتا ہے۔

یہ جو بعض لوگ دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ فراز کے ہاں حسن و عشق کی زمیوں کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب کی جو للکار ہے وہ اسے تضادات کا شکار بنا دیتی ہے، تو یہ حضرات اتنا بھی نہیں جانتے کہ حسن و عشق کے منازل سے گزرے بغیر انقلاب کی للکار اعتماد سے محروم رہتی ہے اور وہی شعراء صحیح انقلابی ہوتے ہیں جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں کے اندازہ داں ہوتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ فراز کا یہ کمال بھی لائق صد تحسین ہے کہ کڑی آزمائشوں میں سے گزرنے کے باوجود وہ اپنی انقلابی شاعری میں بھی سچا شاعر رہا ہے۔ وہ نعرہ زنی نہیں کرتا، صورت حال کا تجزیہ کرتا ہے اور پڑھنے سننے والوں کو اپنی سوچ کے مطابق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کا یہ دعویٰ صد فی صد درست ہے کہ:

دیکھو تو بیاضِ شعر میری
اک حرف بھی سرنگوں نہیں ہے

فراز کے یہ نام نہاد "تضادات" تو اس کے فن کی توانائی ہیں۔ بصورت دیگر وہ ذات اور کائنات کو ہم رشتہ کیسے کر سکتا تھا اور اس طرح کے شعر کیسے کہہ سکتا تھا کہ:

تم اپنی شمع تمنا کو رو رہے ہو فرازؔ
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

خود آگاہی کا یہ وہ مقام ہے جہاں تک پہنچنے کے لیے عمریں درکار ہوتی ہیں۔ میں فراز کے شاعرانہ کمالات کے اس نہایت مختصر تاثر کے آخر میں اس کی غزل میں تغزل کی اس بھرپور فضا سے لذت اندوز ہونا چاہتا ہوں جو غزل کی سی لطیف صنف سخن کی سچی شناخت ہے۔ یہ صرف چند اشعار ہیں جو اس وقت یادداشت میں تازہ ہیں:

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار، مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری لگے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تُو کرے

یہ اس دور کی غزل ہے جس پر احمد فراز نے سالہا سال تک حکمرانی کی ہے اور جو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک الگ باب کی متقاضی ہے۔

○

احمد فراز دلیپ کمار کے ساتھ

اردو شاعری کا سکندرِ اعظم

ضمیر جعفری

ہمارے دور کے منفرد و نامور بلکہ عہد ساز شاعر جناب احمد فراز کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے جائزے کے لیے کم وقت میں لکھے گئے اس تاثراتی مضمون کو تحریر کرتے ہوئے ہمارے اوپر عجلت، سراسیمگی اور بوکھلاہٹ کی وہی کیفیت طاری ہے جس میں ہمارے ایک سابق وزیر اعظم جناب نواز شریف نے حکومت کی باگ ڈور رکھ دی تھی۔ اپنی اوقات ---- من آنم کہ من دانم۔ اس پر طرہ یہ کہ مجھے اپنے اوقات پر بھی کوئی قابو نہیں تو اپنی اس تاریخی جغرافیائی کیفیت میں ---- احمد فراز کے تذکرے کے لئے ---- جواب کتابوں میں نہ سما سکے ---- خواندگان محترم! ---- تفصیل تو کجا، مجھ سے آپ کسی ترتیب کی بھی توقع نہ رکھیں۔

قدرت نے اپنی بے شمار نوازشات میں ایک کرم مجھ پر یہ بھی کر رکھا ہے کہ میں غلط فیصلے بھی ٹھیک وقت پر کرتا ہوں۔ سو میں نے پہلے فراز کی ذات پر بات کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کہ فراز کی شاعری کا تذکرہ مجھ پر نسبتاً سہل بھی ہوگا۔ سہل اس لئے کہ مجھے تجزیاتی سمندروں کے پانیوں میں نہیں اترنا۔ اس کی شائد ضرورت بھی نہیں ہے کہ فراز تو اب شاعری کے اس مقام پر ہے جہاں وہ اپنے معیار خود بنا سکتا ہے

جواں مرد جو چیز چاہیں کریں
مقرر ستاروں کی راہیں کریں

فراز سے پہلی ملاقات 1948ء میں ایبٹ آباد کی پہاڑی پر ---- خان فقیرا خان جدون کے حجرے میں ہوئی جو صوبہ سرحد کی ایک اہم دلچسپ اور پر اسرار صحافتی، سماجی اور سیاسی شخصیت تھے۔ محسن احسان بھی ہمراہ تھے۔ موسم برسات کی یہ شام باہر کی طرح اندر بھی خاصی بھیگی رہی۔ ان دنوں یہ دونوں، اپنی جوانی اور شاعری کی دہلیز پر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ دونوں کے چہروں کی طرح دونوں کی شاعری بھی چونکا دینے والی تھی۔ میٹھے دونوں تھے۔ محسن احسان دھیما اور شرمیلا تھا، فراز، شوخ و شنگ شگفتہ۔ ہزرنگ۔ چھب دلبرانہ، ڈھب جارحانہ ایسا کہ آدمی اس سے مل کر بھول نہ سکے۔ نہ اس کو نہ اس کی شاعری کو۔ فراز ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے جو پروفیسر شوکت واسطی اور راقم نے "کشمیر فنڈ" کے لئے برپا کیا تھا ایبٹ آباد آئے تھے۔ اس مشاعرے میں دو شاعروں ہی سے سامعین کے اصرار پر کشمیر کے موضوع کے علاوہ ان کی مقبول نظموں کی فرمائش کی گئی۔ ابو الاثر حفیظ جالندھری سے "بوڑھی رقاصہ" کی اور احمد فرازؔ نوجوان "لختی" کی۔ اس مشاعرے کا یہ حیران کن منظر بھی مجھے یاد ہے کہ مشاعرے کے اختتام پر "آٹو گراف" لینے کا جتنا ہجوم حفیظ صاحب کے گرد تھا، اتنا ہی ہجوم فراز کے گرد تھا۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس لڑکے کو زیادہ تر کالج کی طالبات نے گھیر رکھا تھا۔ غالباً اس کی شاعری کے ساتھ اس کی شکل بھی سامعین کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ اگلے دن نمبر 9 فرنٹیئر ڈویژن کے ہمارے جنرل افیسر کمانڈنگ (COC) اور صدر مشاعرہ جنرل نذیر احمد بھی اپنے ہیڈ کوارٹر میں چائے پر اپنے گورے "جی ون" (G-1) کرنل بلیک اور ہم دیسی سٹاف افسروں کے میجر زین الدین، اور کیپٹن (اب ریٹائرڈ بریگیڈیئر) قیوم کے سامنے فراز کا تذکرہ کرتے رہے۔ گویا طالبات ہی نہیں جرنیل بھی اس سے متاثر ہوا۔ جنرل صاحب کو کیا معلوم تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر بھی جرنیلوں کو متاثر کرے گا مگر کچھ دوسرے قرینے سے۔

احمد فراز سے ہمارے تعلقات نشیب و فراز سے خالی نہیں۔ ابتداء محبت سے ہوئی۔ پھر کچھ فاصلے حائل رہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ دھند کبھی دیوار نہ بن سکی۔ میرے لئے تعلق خاطر کا یہ عجیب کربناک سا رشتہ تھا۔ جیسے بھیگی ہوئی لکڑی سلگ رہی ہو۔ اس کی کوئی رومانی تخلیق نظر پڑتی تو نظر چمک اٹھتی۔ کوئی "طوفانی چیز" دیکھتا تو دل بیٹھ جاتا۔ نظر ملتی تو نظریات ٹکرانے لگتے۔ نہ اس کو جیب میں رکھ سکتے نہ جیل میں۔ قدم اس کے ساتھ نہ چل سکے، مگر دل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ جس طرح دوسری عالمی جنگ میں ہم ---- ہندوستانی سپاہی ---- انگریز کی فوج میں جرمنی کی فوج کی فتح کے لئے لڑتے رہے۔ ایک مرتبہ اوسلو (ناروے) کی ایک تقریب میں افغانستان کے مسئلے پر ہم دونوں میں جھڑپ بھی ہو گئی۔ میں نے اسے "روسی"

سمجھا۔ اس نے مجھے "دقیانوسی" مگر تھوڑی ہی دیر میں ہم نے اپنا غصہ "ادقیانوس" میں تھوک دیا۔۔۔۔ بہرحال کسی مسئلے پر اختلافات کا یہ مطلب نہیں کہ محاسن کی گواہی نہ دی جائے۔

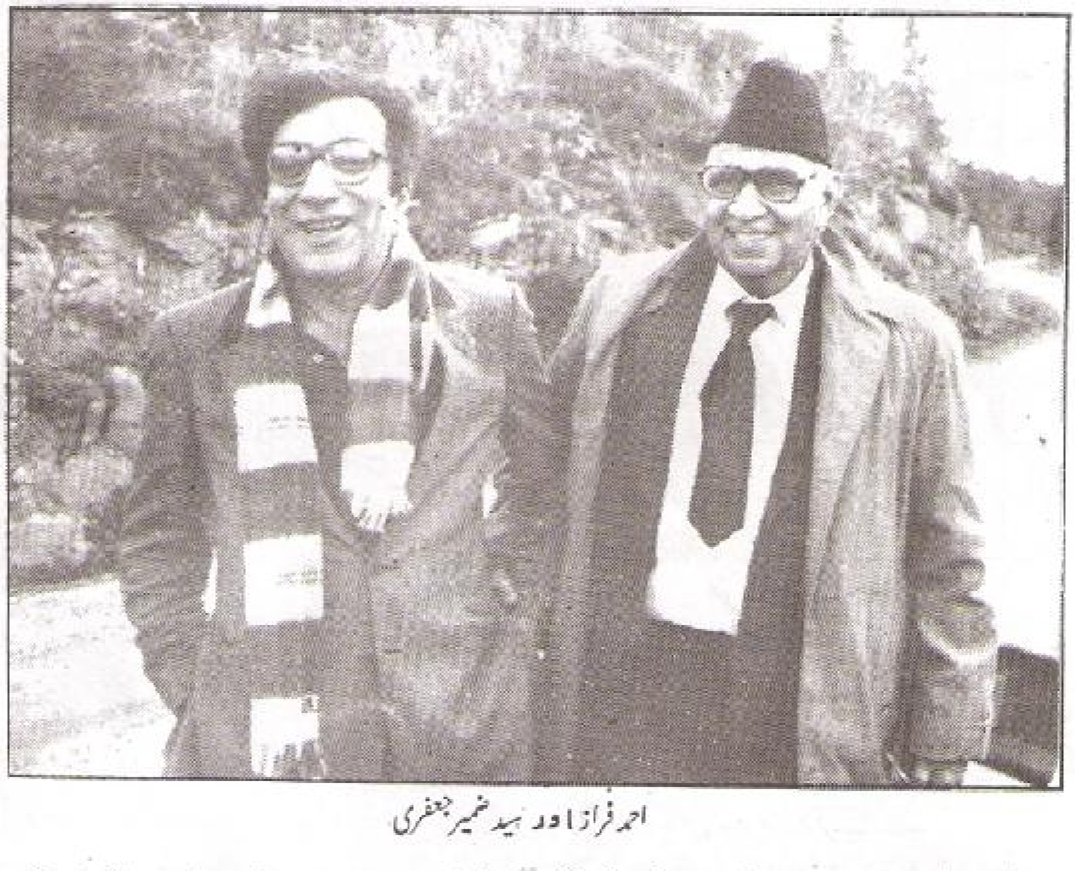

احمد فراز اور سید ضمیر جعفری

فوج کے حوالے سے فراز کی ایک نظم کا بڑا چرچا ہوا۔ ہم بھی اس پر بڑے "لال پیلے" ہوئے۔ مگر جب میں نے اس کے لخت جگر سعدی کو کپتان کی وردی میں پاکستان کی سرحدوں پر سینہ سپر دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ اگر فوج کے خلاف ہوتا تو اپنے بیٹے کو فوج میں کیوں بھیجتا۔ وہ دراصل مارشل لاء کے خلاف تھا۔ ایوب خاں اور یحییٰ خان کے "مارشل لاؤں" میں بھی اگرچہ وہ "غزلیہ چٹکیاں" لیتا رہا۔ مگر ضیاء الحق کے مارشل لاء میں اس کے صبر کا پیمانہ اس طرح چھلکا کہ وہ خود بھی چھلک کر برطانیہ میں جا پڑا۔ فراز اور میں ---- ان دنوں ---- پاکستان نیشنل سنٹر کے سرشتے میں ---- رفیق کار تھے۔ جس کی نوعیت ابلاغی تھی۔ یعنی

ہم تو زندہ ہیں کہ دنیا میں تیرا نام چلے!

فراز کو ملازمت کی ضرورت تھی۔ مگر وہ محکمے کے "میڈیائی فرائض" سے واضح طور پر "ارجک" اور "ڈنگ ٹپاؤ" نظر آتا مارے باندھے اگر کوئی کام کرتا بھی تو اس میں ضرور "مینگنیاں" ڈال دیتا۔ محکمے کے سربراہ جناب احمد حسن شیخ سے اکثر کہا کرتا "شیخ صاحب! مجھے سامنے سے اٹھا کر کسی کونے کھدرے میں ڈال دیجیے" اسی کشمکش میں اس کی برطرفی کی نوبت آگئی۔ اور اس نے برطانیہ میں جا کر "مارشل لاء" کے خلاف محاذ کھول لیا۔

کچھ پہلے میں نے طریق کار کی بات کی تھی۔ فراز کی حب الوطنی کے ایک مظاہرے پر مجھے محسوس ہوا کہ وہ تو مجھ سے بھی زیادہ محب الوطن ہے۔ یہ نومبر 1993ء کی بات ہے۔ ہم لوگ اسلام آباد کے ایک ادبی اجتماع میں کشمیر کے مسئلے پر ایک قرارداد کی حمایت میں اہل قلم کے دستخط حاصل کر رہے تھے۔ قرارداد میں کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت کرتے ہوئے بھارت سے مجلس اقوام متحدہ کی قرارداد کے مطابق اس مسئلے کے تصفیے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ فراز کے بارے میں بعض دوست متذبذب تھے۔ میں کاغذ لے کر فراز کے پاس گیا تو اس نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ تقریباً چنگھاڑتے ہوئے بولا ---- یہ کیا لکھ لائے ہو بابا --- قراردادوں سے کچھ نہیں ہوگا میں دستخط نہیں کرتا --- میں سمجھا وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ مگر پھر جب یہ کہتے ہوئے کہ ------ "یہ قرارداد بڑی بے جان ہے۔ لہجہ معذرت خواہانہ ہے۔ ہمیں کشمیر کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ "اسرٹ" (Assert) کرنا ہوگا ---- تو اس کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوا۔ وہیں ایک صاحب نے بتایا کہ فراز نے اس مسئلے پر بمبئی میں ---- "دوردرشن" کو جو کھری کھری سنائیں۔ یہ "لال پیلا انٹرویو" ---- دیکھنے سننے سے تعلق رکھتا ہے

----کہتا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک دوسرے کی حب الوطنی کے بارے میں سوءِ ظن کرنے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں۔ اور اس عمل میں لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔ فراز سے بہت لوگ دراصل اس لئے بھی خفا ہیں جن میں میں بھی شامل رہا کہ یہ آتش فشاں کیوں ہے "ایش ٹرے (Ashtray) کیوں نہیں -----"موم بتی" کیوں نہیں۔ اس کے بعض نظریات سے نظریاتی بنیادوں پر اختلاف بھی ہو تو کم از کم اس بات کا تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ اپنے مقام پر بڑی استقامت کے ساتھ کھڑا رہا۔ اور بولنے کے وقت خاموش نہیں رہا۔ ایسے لوگوں کو ---- اختلاف کے باوجود احترام کا خراج دینا پڑتا ہے۔ آدمی دانت کا درد برداشت نہیں کر سکتا۔ لوگ فراز سے یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ وطن کا درد خاموشی سے برداشت کرلیتا۔ فراز، کچھ ایسا صحیح نہیں سہی، مگر اس کی خوش قسمتی ہے کہ دوسرے لوگ اس سے زیادہ غلط تھے۔

فراز کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع نیشنل سنٹر کے زمانے کی "ہم دفتری" کے زمانے میں ملا۔ بظاہر وہ مجھے اپنا "برادر" ہی معلوم ہوا کہ گویا ملازمت کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا مگر اس کو معمولات کا حیرت انگیز حد تک پابند پایا۔ دفتری تحریر کے الفاظ روشن۔ مستحکم اور دوٹوک ہوتے۔ انگریزی کے بیچوں بیچ اردو فارسی اشعار کا ترشح خشک دفتری مثلوں کو ایک ادبی چاشنی بخش دیتا۔ میں محکمے کا ---- "کوارٹر ماسٹر" تھا۔ دفاتر کو ---- کاغذ، قلم دوات، میز کرسیوں سے لیس رکھنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ ایک مرتبہ فراز نے کچھ چیزیں طلب کیں۔ میں نے لکھ بھیجا۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!

فائل پر چپڑاسی کے بواپسی ہاتھ لکھا ہوا جواب ملا۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

گفتگو میں اس کے چٹکلوں اور پھلجھڑیوں سے، جو ادب کی چاندنی سے تابدار ہوتیں، دفتر کی بساط واقعی زعفران زار بنی رہتی۔ پر لطف "مشاعراتی آوازوں" سے تو ملک بھر کے ادبی حلقے واقف ہیں مگر اس کے معرکہ کے ادبی لطیفے جو دفتروں کی "فائلوں" میں دفن ہو گئے، ان کی برجستگی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

اس کا پہلا مشاعراتی جملہ، ہم نے ایبٹ آباد ہی کے مشاعرے میں سنا۔ حفیظ صاحب اپنی طویل نظم "رقاصہ" سنا رہے تھے۔ نظم ختم ہونے میں نہ آئی تو ناگاہ فراز کا آوازہ اُبھرا ---- "حفیظ صاحب اٹھہتر واں شعر مکرر ارشاد ہو" اور ---- اکتائے ہوئے سامعین کے قہقہے کاکول تک گونج گئے۔ ---- لوگ باگ حفیظ صاحب جیسے تنک مزاج سینئر شاعر کے ساتھ اس لڑکے کی جسارت پر حیران تو ہوئے مگر اس کی شکر آوری میں ذہانت پر نہال اور ممنون بھی ہوئے۔ اس کی گفتگو بے حد دلچسپ، نکتہ آفرینی کی ایک رنگین اور خوبصورت پھلواری ہوتی ہے۔ صحیح بات عموماً برمحل کہتا ہے لیکن کبھی کبھی غلط بات کو صحیح وقت پر چھوڑنے میں تاخیر بھی کر دیتا ہے۔

احمد فراز کے رومانوں کا بڑا چرچا ہے مگر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ دراصل اپنے آپ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ جو ایک جذباتی رویئے کے اعتبار سے ---- بعض اوقات ---- خود پسندی کا ایک اجلا ہمسایہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

فراز کی شاعری پر میں کوئی لمبی بات نہیں کروں گا۔ مجھے نقادوں کی طرح بات کرنی آتی ہی نہیں۔ مجھے تو اس کے بارے میں بنیادی طور پر یہ سیدھی بات کہنی ہے کہ اپنے زمانے میں جن دو چار شعراء کو ہم نے بچشم خود ---- قطرے سے سمندر اور ذرے سے "راکاپوشی" اور "کے ٹو" وغیرہ بنتے دیکھا، ان میں احمد فراز ایک الگ تمکنت رکھتا ہے۔ اور بیکن نے فراز جیسے شاعروں ہی کے لئے کہا ہے کہ ---- ان کی خوبصورتی ہی ان کے لئے بہترین سفارشی خط ہوتی ہے" ---- فنی موشگافیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ فراز کی شاعری بیک وقت گلاب کا پھول بھی ہے اور آگ کا الاؤ بھی۔ صوفیا کی طرح اس کی شاعری کا پیرہن ہلکا اور خیالات وزنی ہوتے ہیں ---- وہ آنکھ کی شاعری بھی کرتا ہے اور دماغ کی بھی ---- مجھے ذاتی طور پر اس کی آنکھ والی شاعری زیادہ مرغوب ہے کہ یہ درخت کی طرح ---- دل کی زمین سے اگتی ---- ذہن میں مہکتی ---- زندگی میں پھیلتی اور زبانوں پر پھلتی پھولتی چلی جاتی ہے۔ اس کی شاعری زندہ دلوں سے زیادہ مردہ دلوں کے لئے ضروری ہے۔ اور توانائی اور تنوع کے اعتبار سے ---- مختلف ذائقوں کے پانیوں کا ایک وسیع سمندر ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کو کس دھج سے زندہ رہنا چاہیئے۔ مجھے، اس کی شاعری سے تسکین نہیں ملتی ---- خواہشات میں تحریک اور تجدید کا احساس ہوتا ہے ---- خون میں دفعتاً کچھ نئی چنگاریاں لشکارنے لگتی ہیں ---- اس کے فن میں ٹھہراؤ نہیں۔ ٹھہراؤ آئے بھی کہاں سے کہ وہ تو اب ساٹھ برس کی عمر میں بھی وہی اٹھارہ بیس برس کا لبرل۔ انقلابی انڈر گریجوایٹ نوجوان ہے۔ جو دماغ سے کچھ آگے ہی چلتا ہے۔ کیونکہ وہ ماضی کی تاریخ کے بجائے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ اس کی کتابوں کے مطالعہ سے نچلے معاشرتی طبقے کے آدمی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ فراز اس کے لئے اونچے طبقے میں جگہ خالی کروا رہا ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنویت پیدا کرتا ہے۔ مصرعوں کو انگور کی بیلوں کی طرح تراشتا ہے تاکہ پھل زیادہ اترے اور ذائقہ زیادہ "سوادلا" ہو۔ یہ تو اسی کے فن کا اعجاز ہوا جس نے اس کی شاعری کو شہد کی طرح میٹھا

اور چائے کی طرح تیز اور پر حرارت کر دیا ہے۔ فکر کے اعتبار سے اس کو دنیا کے ان شعراء کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے جنہوں نے بنی نوع انسان کی غلامی کو کم کیا ہے۔ ایسے شعراء تو بہت ہیں کہ لوگ ان کا لکھا ہوا چاؤ سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ مگر فراز کو ---- فیض اور جالب کی طرح ---- جو بات دوسرے شعراء سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کچھ ایسے کام بھی کر گیا کہ لوگ اس کو محبت سے یاد بھی رکھنا چاہتے ہیں میں اپنے ایک تاثر کو واضح طور پر بیان کر سکوں یا نہ کر سکوں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ فراز اسی قسم کی شاعری کرتا ہے، جس کیلئے شاعری تخلیق ہوئی ہے تاریخ میں اس کا شمار ان شعراء میں ہوگا "جن کے دل سے "علامہ اقبال کے ایک قول کے مطابق ---- "قومیں جنم لیتی ہیں" ---- اس عہد کے ایک بے حد مقبول اور اتنے ہی متنازعہ فی شاعر کی حیثیت سے فراز کی حمایت اور مخالفت میں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور لکھی جائیں گی ملک میں نہ اس کے مداحوں اور محبت کرنے والوں کا کوئی شمار ہے اور نہ ناپسند اور مسترد کرنے والوں کا۔ سو میں تو اسی تناظر میں احمد فراز کو ---- اردو شاعری کا ذوالفقار علی بھٹو کہنا چاہوں گا اور اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ احمد فراز کو نہ ہمارا ادب فراموش کر سکتا ہے اور نہ ہماری تاریخ۔

(30 جنوری 1994ء)

شام ہمدرد جناب افتخار عارف کو وثیقہ اعتراف" دیتے ہوئے ہمراہ حکیم سعید صاحب اور جناب منیر جعفری

[illegible] کا شاعر

[illegible] نثار

بہت پہلے فراز نے ایک شعر کہا تھا!

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سُورج کو دکھاتے ہیں چراغ

آج اسی سادگی کی شکار ہوں اور ستم یہ کہ صاحب شعر کی مرضی کے عین مطابق یوں ایک دشوار مرحلہ میرے لیے دشوار تر ہو گیا ہے۔ تمہا تمہا پڑھتے ہوئے ایک نظم کی تاریخ 1952ء دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکی کہ فراز کی اس نظم کا اور میرا سن پیدائش ایک ہی ہے مقصود اس بات سے میرا عمر کے بارے میں عورتوں کا عالمی (COMPLEX) نہیں ہے بلکہ اپنا عجز بیان کرنا ہے جس میں ایک ہلکا سا احساس افتخار بھی شامل ہے کہ فراز نے اپنے آپ پر گفتگو کے لیے اتنی جونیئر ساتھی کا انتخاب کیا۔ اگر میں ادب کی عام طالبہ ہوتی تو خاتون ہونے کے باوجود اس طرحدار شاعر کے بارے میں کچھ لکھنا اتنا مشکل نہ ہوتا مگر مشکل یہ ہے کہ فراز جس قافلے کے سالاروں میں ہے میں بھی اس کی مسافر ہوں اس قافلے میں ہر راہرو کی اپنی الگ طرز نوا ہے اور (COMMUNICATION) اس وقت مسئلہ بن جاتا ہے جب ہر پیامبر کی اپنی الگ بولی ہو۔

دیکھا گیا ہے کہ بہت زیادہ لاڈ پیار میں پلنے والے بچے، اپنے خاندان کے لیے (PROBLEMCHILD) بن جاتے ہیں فراز اردو ادب کا پرابلم چائلڈ ہے۔ اس کے سینئرز اس سے یوں خفا ہیں کہ اس کی آمد کے بعد کے نوجوانوں نے بزرگوں کی قبل از تاریخ تصنیفات کو سننے سے انکار کر دیا ہے اس کے ہم عصر اس سے یوں نالاں ہیں کہ وہ اپنے سامنے ان کا چراغ نہیں جلنے دیتا، مشاعرے میں خوبصورت لڑکیوں کی محفل میں اس کے جونیئرز کو گلہ ہے کہ فراز ہماری جدیدیت کا مضحکہ اڑاتا ہے اور شاعر جن کی روزی اور شاعری کا دارومدار مشاعروں پر ہے فراز سے یوں برگشتہ رہتے ہیں اگر کوئی سرکاری ادارہ بھی مشاعرہ کروا رہا ہو اور فراز کی کسی غزل سے پاکستان کی دو مشہور چیزیں خطرے میں پڑ رہی ہوں تو وہ وہاں غزل تو بے حد، بے ضرر سنا جائے گا مگر انہیں اپنی سکرین بیوٹی سے مار دے جائے گا۔

وہ شاعر جو اپنے کلام سے زیادہ مغنیوں پر اعتماد کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ فراز کی آدھی سے زیادہ شہرت مہدی حسن کی مرہون منت ہے۔ ڈھلتی ہوئی عمر کے شعراء اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں کہ فراز تو (TEENAGERS) کا شاعر ہے جو زیادہ زخم خوردہ ہیں وہ اس سے بھی ایک قدم آگے جا کر فتویٰ جاری کرتے ہیں کہ فراز تو لڑکیوں کا شاعر ہے اور جو تین میں ہیں نہ تیرہ میں نقاد فراز کے فقروں کی کاٹ سے اتنے خائف رہتے ہیں کہ اپنے علم کا سارا زور فراز کی شاعری میں لف و نشر مرتب و غیر مرتب ڈھونڈنے میں لگا دیتے ہیں، موضوع کی طرف ذرا کم ہی رخ کرتے ہیں۔

حالانکہ فراز کا موضوع کوئی اتنا گھبرا دینے والا نہیں، ذہنی اور جسمانی طور پر

تمام صحت مند لوگ زندگی میں ایک نہ ایک بار اس تجربے سے ضرور گزرتے ہیں اور ہمارا شاعر تو اس معاملے میں قسمت کا خاصا دھنی ہے، فراز CHAIN SMOKER ہے یا نہیں اس کا پتہ تو اس کے قریبی دوستوں کو ہو گا مگر اس کی شاعری پڑھ کر اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ CHAINLOVER ضرور ہو گا۔ تنہا تنہا سے لے کر جاناں جاناں تک پڑھتے جائیے ہر صفحہ پر آپ کو دھوئیں کا ایک نیا مرغولہ اور میداں کا ایک نیا سلسلہ نظر آئے گا اور آخر میں ایلیٹ کے الفریڈ کے کمرے کی طرح آپ کے ذہن کا فرش صرف یادوں کے BUTT END سمیٹتا رہ جائے گا۔

مشتاق احمد یوسفی کا کہنا ہے کہ مرد پہلی بار عشق کرتا ہے دوسری بار بدمعاشی اور تیسری بار نری عیاشی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فراز کو اپنی عمر کے اس پہلے PHASE سے نکلے ہوئے زمانہ گزرا مگر اس کی شاعری میں نری عیاشی تو دور کی بات ہے۔ بدمعاشی بھی خال خال ہی نظر آتی ہے اس سنبھلے ہوئے رویے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے جواب فراز نے خود فراہم کر دیا ہے کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی ہے۔

فراز نے کوہاٹ میں پیدا ہو کر نہ صرف اردو ادب میں ڈومی سائل کے تصور کو یکسر نابود کر دیا، بلکہ شاعری کے بعض روایتی موضوعات کی P.R.C بھی کینسل کر دی کسی سراپا ناز سے پیش دستی اس نے بارہا کی ہو گی مگر شاعری میں اس دھول دھپا کو بار نہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ فراز کی زندگی اور اس کی شاعری کے درمیان کسی کا آنچل حائل ہے۔

مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہوں
مگر ہر ایک بار تجھ کو چھو کر
یہ ریت رنگ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں

احترام اور محبت کی فضا دراصل اس بات سے مشروط ہے کہ آپ نے محبت کس سے کی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جادو چاہے تو دیوتا بنا دے اور چاہے تو راکھشس، فراز کو عشق نے فرشتہ بنایا نہ شیطان، ہماری ملاقات ایک بھرپور انسان سے ہوتی ہے جو فریق مخالف کے انسان ہونے پر بھی پورا یقین رکھتا ہے اور ملنے لانے میں حجابوں کو خاصی (OUTDATED) چیز سمجھتا ہے۔

فراز اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے عشق کو آسودگی کا تصور بخشا ہے۔

آج اس نے شرفِ ہم سفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہش منزل نہ رہی

اگرچہ اس نے بہت پہلے بھی کہا تھا۔

کہاں ہے دوست کہ آشوب دہر سے میں نے
تیرے خیال کی آسودگی بچالی ہے

یہ آسودگی خیال ہی تک محدود نہیں، اس کی حدیں جمال تک جاتی ہیں بلکہ وصال تک! فراز نے اپنے عشق میں کامیابیوں سے وہی کام لیا ہے جو میر نے ناکامیوں سے لیا، دونوں کا سلیقہ ان کو منفرد بنا دیتا ہے۔

اگر اردو شاعری کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو فراز کا محبوب روایتی محبوب سے خاصا مختلف نظر آئے گا وہ نہ ولی دکنی کا تیغ انداز ہے نہ میر کا سبزہ خط نہ غالب کی ستم پیشہ ڈومنی نہ ہی دیومالائی۔ حسن کا مالک ان کی یکجائی کی وجہ بہت سادہ ہے۔

نبھا رہا ہے یہی وصف دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا بے نظیر میں بھی نہ تھا

اردو شاعری میں یہ محبوبہ قبلہ داغ دہلوی تک بالاخانے پر مقیم رہی، جگر کے ساتھ پہلی بار اس نے اپنا پاؤں زمین پر رکھا اور حسرت کے ساتھ ایوان ادب میں اردو شاعری کی پہلی کرن داخل ہوئی، اس بنت عم کی آمد سے اور کچھ ہوا ہو یا نہیں، شاعری ضرور مہذب ہو گئی۔ کوٹھے پر ننگے پاؤں جانے میں بھی آنگن کا خیال ساتھ رہا۔ اس گھریلو فضا کا تقدس اپنی جگہ۔ مگر یہ فضا کچھ عرصے اور رہتی تو تندی صہبا سے یہ آبگینہ ضرور پگھل جاتا، شاعری صلہ رحمی زیادہ دیر تک افورڈ نہیں کر سکتی۔ رشتہ داروں کے اس قافلے نے افسانوی ادب لطیف کی طرف رخ کیا۔ علامتوں نے انہیں کب کا دیس نکالا دے رکھا تھا، لیکن خدا خواتین کے ڈائجسٹوں کو سلامت رکھے جملہ اعزاء اب مستقلاً وہیں آباد ہیں۔

خیر تو بات ہو رہی تھی فراز کے محبوب کی، نہ معلوم کیوں فراز نے ان کے سراپے پر زیادہ توجہ نہیں دی وہ باریکیاں اور نزاکتیں جن کے بیان سے لکھنؤ کے شعراء اپنی اپنی عاقبت سنوارتے اور قارئین کی نیندیں حرام کر لیتے تھے، فراز کے یہاں ان کا سرسری ذکر بھی ذرا کم ہے آنکھوں، ہونٹوں رخساروں کا ذکر ہے تو مگر کچھ یوں ہی سا ہے۔

زلف راتوں کی ہے رنگت ہے اجالوں جیسی

سے بات آگے نہیں بڑھتی اگر ان رنگوں اور خطوط سے آپ کوئی واضح تصویر بنانا چاہیں تو وہ دھندلی ہو گی چاہے نفسیاتی نقاد فرائڈ اور میکلے کے یہاں سے اس دھندلاہٹ کا کوئی بھی جواز لائیں۔ میرے نزدیک تو اس کی ایک ہی وجہ ہے چہروں کی کثرت! ان میں سے بیشتر تقریباً ایک ہی سے ماحول کی پیداوار ہیں ثقافتی تقریبات، ڈنرز، نجی ادبی محفلوں اور ہوائی سفر میں برابر کی سیٹ پر بیٹھنے والے لوگوں

کے سر آپ بڑی آسانی سے دوسرے کے جسم پر فٹ کرسکتے ہیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔

فراز کا محبوب روایتی تصور سے یوں بھی مختلف ہے، اس کا سن شاذ ہی سولہ یا سترہ کا ہوتا ہے۔ اگرچہ عشق کے لیے لڑکی کی آئیڈیل عمر سولہ برس ہے اور آئیڈیل صفت حماقت تسلیم کی جاتی ہے مگر فراز اپنی برادری سے ذرا ہٹ کر سوچتے ہیں، یہاں فراز کی شرط ذرا کڑی ہے۔

ہر حسن سادہ لوح نہ دل میں اتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

اگرچہ فراز کی شاعری کا غالب موسم خزاں نہیں ہے تاہم وقت کے اعتبار سے فراز کے کلام کو ان کے آخری پہر کا گیت کہا جاسکتا ہے جھٹپٹے کا وقت جب دن ڈھل رہا ہو اور شام کا سرمئی آنچل لہراچکا ہو گزرے ہوئے دن کی تھکن کو آنے والی مہربان رات کے ہاتھ بس اب چھونے ہی والے ہیں، رات جو صرف تاریکی اور اندھیرا ہی نہیں، جگنو چاندنی اور خوشبو بھی ہے۔

یہ رویہ عموی طور پر فراز کی پوری شاعری پر طاری ہے، ابھی اس کا ایک خمار پوری طرح ٹوٹتا نہیں کہ دوسرا نشہ رگوں میں اترنے لگتا ہے۔

احمد فراز فراعنہ مصر کے میوزیم مین قدیم طرز کی کرسی دیکھتے ہوئے دسمبر 1994ء

اور مزاج یار میں گہرائیاں بہت ہی آتی ہیں جب یار نے زندگی میں کچھ دھکے کھائے ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فراز کے یہاں ہمیں ایسے لوگ بار بار نظر آتے ہیں جن کی باتیں رکی رکی سی اور لہجہ تھکا تھکا سا ہوتا ہے فراز کے بہت سے پیارے اس طرح اس کی بے وفائی کا زخم دل میں لیے آن ملتے ہیں۔

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ تو میرا نہیں تھا اور میں تیرا نہ تھا

یا تجھے دیکھ کے بھر آئے خوشی سے آنسو
یا مری آنکھ میں گزری ہوئی شب ہے کوئی

اپنے اس رویے کی وضاحت فراز نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں اس طرح کی ہے "میں نے ہمیشہ ایک محبت کی خاطر دوسری محبت سے بے وفائی کی ہے" مگر فراز کی اپنی طبیعت کا تلون بہرحال ظاہر ہے۔

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز
مل گئے تم بھی تم کیا اور نہ جانے مانگے

ہم ترے لطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دکھا ہوتا ہے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہوگئے

فراز کی اس سیمابی طبیعت کے نتیجے میں جو عشق وجود میں آئے گا وہ شعلہ مستعجل ہی ہوگا مگر اس خوش درخشندگی میں بہرحال کلام نہیں۔۔

اپنی باہوں میں سمٹ آئی تھی وہ قوس قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کئے انگڑائی کی

یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

ملنا جتنا خوش گوار تجربہ ہوتا ہے۔ بچھڑنا اتنا ہی اذیت ناک، بہت سے لوگ جدائی کے لیے حوصلہ ہار دیتے ہیں مگر فراز کو بچھڑنے کے آداب ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔

کھینچی ہوئی ہے مرے آنسوؤں میں اک تصویر
فراز دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے

یا وہ یا تھا بچھونا تیرا
یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا
پھر نہیں یاد کہ کیا یاد آیاد

کیسے پایا تھا تجھے پھر بس طرح سے کھو دیا
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہوگیا تقدیر کا،

عشق میں جدائی سے زیادہ کڑا مرحلہ ترک تعلق کا ہوتا ہے DETER MINATION کے فلسفے کے تحت کسی کو کھونے پر تقدیر کا قائل ہونا فطری ہے مگر جب فریقین کی مرضی سے ایک رشتہ منقطع ہو جائے تو وہاں مشیت کا جبر بہرحال مورد الزام نہیں۔

ہزار بار کیا ترکِ دوستی کا خیال
مگر فراز پشیماں ہزار بار ہوئے

فراز ترکِ تعلق تو خیر کیا ہوگا
یہی بہت ہے کہ کم ملا کرو اس سے

یہاں بے بسی کے علاوہ ایک امر اور بھی مانع ہے۔

ہے ترک تعلق ہی مداوائے غمِ جاں
پر ترک تعلق بہت خوار کرے ہے

اس رسوائی کے خوف نے کبھی کبھی فراز کو یوں بھی سہارا دیا ہے

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی مرا ہم خیال ہو

لیکن ظاہر ہے کہ عشق میں منافقت زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتی اور آخر ترک تعلق ناگزیر ہی نظر آنے لگتا ہے۔۔

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

اولیں زمانے کی یہ جھجک بالاخر ایک واضح فیصلہ بن جاتی ہے۔

ہمیں نے ترکِ تعلق میں پہل کی کہ فراز
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اس کا

محبوب کی کم حوصلگی ہی نہیں اور مجبوریاں بھی فراز کی سمجھ میں آجاتی ہیں اس کا محبوب اس کا قاتل ہی نہیں مسیحا بھی ہے' یہ وصف مسیحائی بھی ہمیں روایتی محبوب میں ذرا کم ہی نظر آتا ہے۔

تجھ کو یہ دکھ کہ مری چارہ گری کیسے کرے
مجھ کو یہ غم کہ مرے زخم نہ بھر جائیں کہیں

فراز کا محبوب "اگر اسے چھوڑ جاتا ہے' تو فراز خود ہی اس کا جواب بھی ڈھونڈ لاتا ہے۔"

مزاج ہم سے زیادہ جدا نہ تھا اس کا
جب اپنے طور یہی تھے تو کیا گلہ اس کا

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
کہ اب کبھی اسے الزام بے وفائی نہ دوں

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آسکے

وہ لاکھ زود فراموش ہو فراز مگر
اسے بھی مجھکو بھلانے میں اک زمانہ لگا

اردو شاعری میں یہ رواداری اپنی نوعیت کا پہلا نہیں تو منفرد واقعہ ضرور ہے اس لیے کہ جس معاشرے میں الزام کی تصدیق کے بغیر تعلقات ختم کرنے کی رسم ہو وہاں کسی شخص کی بے وفائی کا جواز ڈھونڈ لانا بڑے حوصلہ کی بات ہے۔

اگرچہ کہیں کہیں فراز کا لہجہ تلخ ہو جاتا ہے۔۔

بنا بنا کے بہت اس نے جی سے باتیں کیں
میں جانتا تھا مگر حرف گیر میں بھی نہ تھا

مگر مجموعی طور پر اس کا رویہ۔

"تم بھی پابستہ زنجیر حنا

سے آگے نہیں جاتا۔ محبوب کے ساتھ محب کی جو کڑی ذمہ داری ہمیں میر وفائی کے یہاں نظر آتی ہے، فراز کے یہاں وہ بھی نہیں، میر صاحب نے خود اس کی توضیح کی ہے۔

ہو گا کسی دیوار کے سائے کے تلے میر
کیا کام محبّت سے اس آرام طلب کو

جبکہ فراز ہمیں بیشتر سایہ دیوار بلکہ سایہ گل میں نظر آئے گا یہ آرام طلبی فراز کو اردو شاعری کے مستند عاشق کی حیثیت سے تو QUALIFY نہیں کرتی مگر محبت اس کے کلام میں چاندنی بچھاتی چلی جاتی ہے جس سے ہجر کی راتیں بھی روشن اور خنک ہو جاتی ہیں۔

محبت کی مثلث کے تیسرے ازلی زاویے رقیب کیساتھ بھی فراز کا رویہ حیرت انگیز ہے فیض نے جس روسیاہ کو پہلی بار عزت بخشی تھی اس کا تہذیبی پس منظر کچھ اور تھا، حیرت ہے اس موقع پر فراز کا قبائلی خون بالکل نہیں کھولتا، سچ کا ذکر اسے خاموش کر دیتا ہے اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔۔

ایک زخم اور بھی پہلے کی طرح سہ جاؤں
جس پہ پہلے بھی کئے عہد وفا ٹوٹے ہیں
اسی دورا ہے پہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں

فراز نے اس موقع پر بزدلی کے طعنے کی بھی پروانہ کی شاید شہر میں رہنے کے لیے سمجھوتے ضروری ہوتے ہیں یا پھر فراز کے رفیقوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ عرفی کی طرح رزق گدائی فراہمی پر یقین رکھتا ہے اور آواز سگاں پر چنداں کان نہیں دھرتا ایک آدھ رقیب بہرحال ضروری ہوتا ہے۔

فراز جیت کر ہارنے میں خوش ہے، یا زندگی کا یہ سوئمبر اس نے کتنی بار جیتا ہے اسے خود بھی یاد ہے، شاید اس لیے اس کا فراق اس کے وصال سے زیادہ دل کش نہیں کہ اس کے یہاں وفاداری تو ہے مگر بشرط استواری نہیں۔

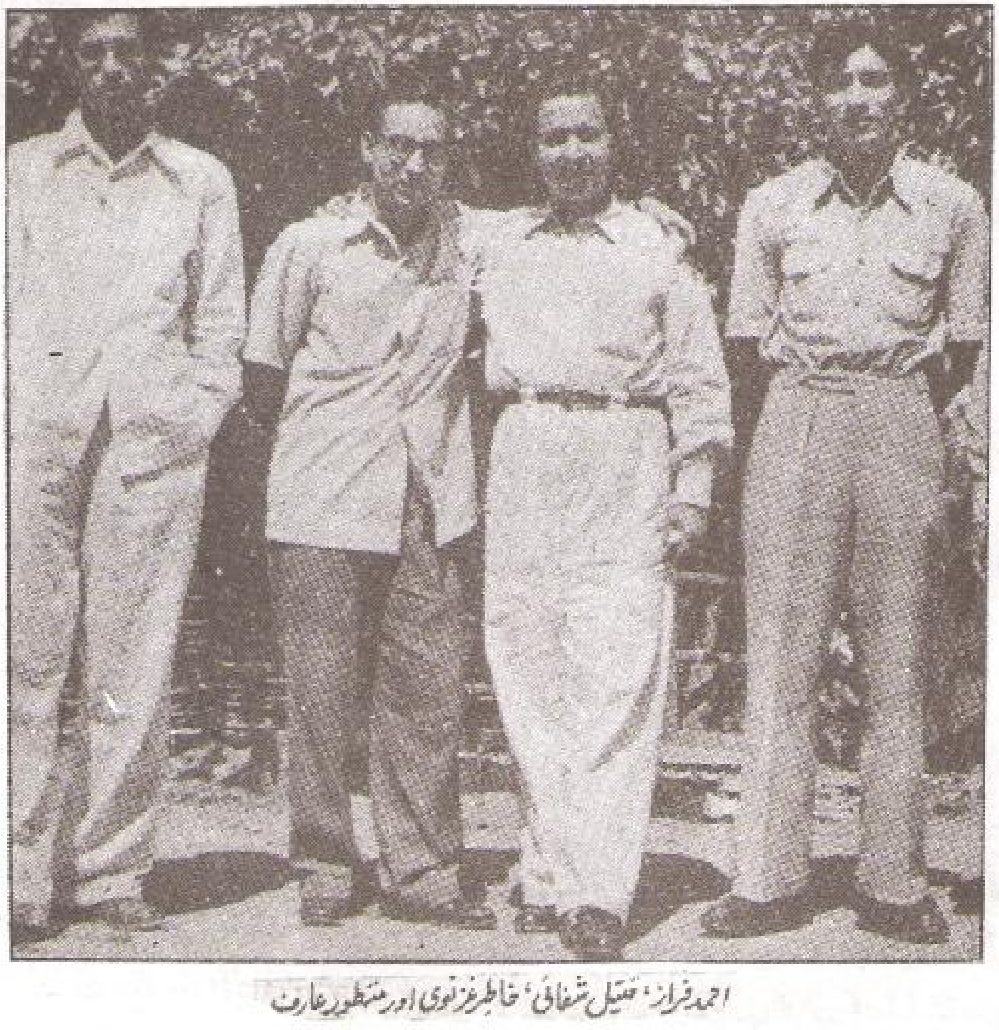

احمد فراز، قتیل شفائی، خاطر غزنوی اور منظور عارف

عہد موجود کا سب سے بڑا شاعر احمد فراز — عامر زیدی

"پدرم سلطان بود" کہتے، لکھتے اکثر سنا اور پڑھا ہے مگر "پسرم" کے حوالے سے احمد فراز کا فخریہ ذکر میں نے (آغا سید محمد شاہ) برق کوہاٹی مرحوم کی فارسی نظموں کے ایک مجموعے میں پڑھا۔

آغا برق کوہاٹی، سید احمد فراز کے نامور والد گرامی تھے۔ اردو، فارسی کے صاحبِ فن شاعر، خصوصاً فارسی کے ایسے قادر الکلام شاعر، جن کی فارسی گوئی اور فارسی دانی کو اہل فارس یعنی ایرانی بھی مانتے ہیں۔ 12 جنوری، احمد فراز کی تاریخ پیدائش ہے اور صوبہ سرحد کا مشہور شہر کوہاٹ ان کی جائے پیدائش۔ سنہ پیدائش

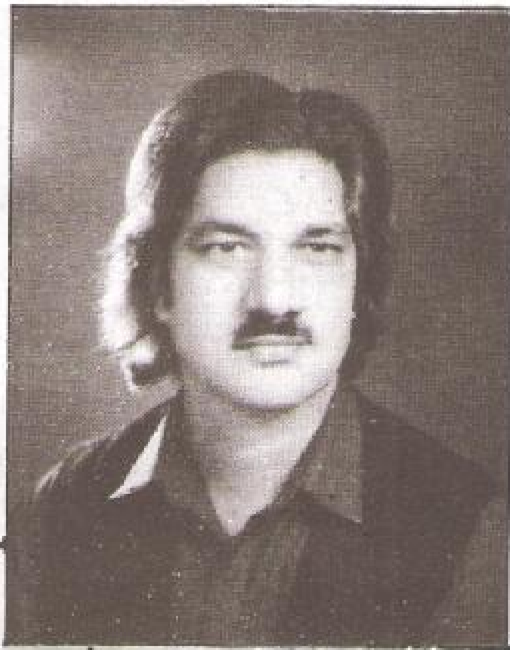

کچھ بھی ہو "ساٹھے پاٹھے" بہرحال ہیں مسٹھیائے ہوئے ہرگز نہیں۔

شروع شروع میں آج کے ممتاز و منفرد شاعر احمد فراز نے اپنا تخلص شرر رکھا تھا اور اپنے والد محترم کی نسبت سے برقی کا لاحقہ لگا کر شرر برقی ہو گئے تھے مگر پھر کسی نے کہا۔

"رات نکا کھلا رہ گیا تھا، پانی شرر شرر بہتا رہا" ---- ! یہ سن کر شرر برقی سے تائب ہو گئے۔ شرر برقی اب ایک ایسا نام ہے جسے کوئی نہیں جانتا، احمد فراز کو البتہ ایک زمانہ جانتا اور مانتا ہے۔ ایم۔ اے تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہ محکمہ تعلیم، ریڈیو پاکستان، نیشنل سینٹر، اکیڈمی آف لیٹرز، لوک ورثہ جیسے مختلف سرکاری اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر رہے مگر مجموعی طور پر رہے کم، نکالے زیادہ گئے۔ آجکل نیشنل بک فاؤنڈیشن اور پاکستان بک کونسل کے مینجنگ ڈائریکٹر ہیں۔

شاعری اور صرف شاعری احمد فراز کے لئے وجہ شہرت و عزت بنی اور شاعری ہی حصولِ زر کا سب سے بڑا ذریعہ بھی۔ شاعری کی کتابوں کی مد میں رائلٹی کی صورت میں جتنی یافت انھیں ہے۔ اتنی کسی اور شاعر کو نہیں۔ احمد فراز کی عوامی اور عالمی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی مشاعرہ ان کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی شاعری کے مجموعے فروخت کے اعتبار سے ناقابلِ یقین ریکارڈ رکھتے ہیں۔ اب تک شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں "تنہا تنہا"--- "جاناں، جاناں" --- "نایافت" --- "شب خون" --- "مرے خواب ریزہ ریزہ" --- درد آشوب" --- "بے آواز گلی کوچوں میں" --- "نابینا شہر میں آئینہ" --- "سب آوازیں میری ہیں" --- "پس انداز موسم" اور "خوابِ گُل پریشاں ہے" شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مجموعے "درد آشوب" پر پاکستان رائٹرز گلڈ کی وساطت سے پاکستان کا سب سے بڑا ایوارڈ "آدم جی ادبی انعام" مل چکا ہے۔ اور "پس انداز موسم" پر اکادمی ادبیات پاکستان کے تحت سب سے بڑا ایوارڈ "علامہ اقبال ایوارڈ" مل چکا ہے۔

شاعری میں احمد فراز کا کوئی استاد نہیں، ابتدا میں جب یہ شرر برقی تھے تو ممکن ہے والدِ گرامی آغا برق کوہاٹی نے ان کا کلام بہ نظرِ اصلاح دیکھا ہو لیکن احمد فراز کی حیثیت سے یہ خود ہی استاد ہیں۔ البتہ ان کے ایک بہت ہی عزیز دوست، ہمدم و ہمراز ہیں ضیاء الدین ضیا جو مشہور شاعر سیف الدین سیف مرحوم کے بھائی ہیں۔ ان کی دوستی پر انھیں اور ان کی دوستی پر انھیں ناز ہے۔ گویا بقول نصرت قریشی مرحوم ؎

بیگانگیٔ دہر کا نصرت گلہ نہیں
اک دوست مل گیا ہے وفا آشنا مجھے

احمد فراز ہر دور کے شاعر ہیں، ہر عہد کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اُس وقت بھی بڑی جاندار شاعری کی جب بہت سے شاعر مصلحتوں کے سبب خاموش رہے یا فرضی ناموں سے لکھتے رہے یا شاعری میں ایسی علامتوں کا سہارا لیتے رہے، جو جابر سلطان

ے کیا کسی کے بھی پلّے نہ پڑ سکیں۔ احمد فراز انتہائی جبر کے طویل دور میں بھی لب کشار ہے اور عام لوگوں کے دلوں کی آواز بنے رہے۔ ؎

محفل میں کل فرازؔ ہی شاید تھا لب کُشا
مقتل میں آج کاسۂ سر بھی اُسی کا تھا

احمد فراز کو جو عزت و شہرت ملی اس کا فائدہ دوسروں نے بھی خوب خوب اٹھایا، مثلاً فراڈ فنانس کمپنیوں کے دور میں ان کے نام پر کراچی میں "احمد فراز گروپ آف کمپنی" تشکیل پایا اور اس نے خوب مال بنالیا تو ہمارے توجہ دلانے پر بالآخر احمد فواد گروپ آف کمپنیز" کرلیا۔ لاہور میں "احمد فراز کی جاسوسی دنیا" کے نام سے بے شمار جاسوسی کتابیں چھپ کر بکتی رہیں۔ شاعری کے انتخاب پر مبنی ایک کتاب "غالب سے فراز تک" کے عنوان سے چھپی۔ اس پر بطور مرتبین احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز کا نام درج تھا۔ یہ اس لئے خاموش رہے کہ شاید احمد ندیم قاسمی نے یہ انتخاب کیا ہو اور ان کا نام از رہِ محبت دے دیا ہو اور قاسمی صاحب اس لئے چپ رہے کہ شاید احمد فراز نے ان کا نام احتراماً تعلق خاطر کے سبب چھاپ دیا ہے۔ جب کتاب کے کئی ایڈیشن بک گئے اور عقلمند پبلشر مال بنا چکا تو کھلا کہ انتخاب ان دونوں کا نہیں ہے۔

شام ہمدرد کی تقریب "احترام شاعر امروز" کے سلسلے میں صاحب شام ناصر زیدی کو صدر تقریب احمد فراز "وثیقہ اعتراف" دے رہے ہیں چیئرمین ہمدرد فاؤنڈیشن حکیم محمد سعید ساتھ ہیں

مشہور ریکارڈنگ کمپنی ای ایم آئی کا 20 غزلوں کا ایک کیسٹ "احمد فراز کی شاہکار غزلیں" کے نام سے بازار میں موجود ہے، جس میں 18 غزلیں تو احمد فراز کی ہیں مگر دو غزلیں ان کے ساتھ ساتھ دو دوسرے شاعروں کو مشہور کرنے کے لئے شامل کر دی گئی ہیں۔

احمد فراز، ہر عہد پر غالب مرزا اسد اللہ خان غالب کے بے حد شیدائی ہیں۔ عموماً لوگ حافظ شیرازی کے "دیوان" سے فال نکالتے ہیں جبکہ یہ "دیوانِ غالب" سے فال نکالتے ہیں۔ گزشتہ برس یعنی یکم جنوری 94ء کو اتفاق سے میرے سامنے فال نکالی تو غالب کا شعر نکلا ؎

دیکھیے پاتے ہیں عُشّاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھّا ہے

فال نکالنے کے چند روز بعد ہی ان کی بطور ایم ڈی، نیشنل بک فاؤنڈیشن تقرری کے احکام آ گئے۔ اور چارج لینے سے پہلے دوبارہ انھیں عمرے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی۔ یکم فروری 94ء کی صبح چارج سنبھالا اور اسی شام انھیں "ہمدرد فاؤنڈیشن" کی جانب سے "احترام شاعر امروز" کے سلسلے میں ان کی ادبی خدمات پر حکیم محمد

سعید کی جانب سے "وثیقۂ اعترافِ عظمت" پیش کیا گیا۔ اس سے کچھ دن پہلے ان کی سالگرہ کے موقع پر موقر ادبی جریدے "جریدہ" پشاور کا عظیم و ضخیم "احمد فراز نمبر" شائع ہو کر مارکیٹ میں آیا۔ اس میں وزیر اعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنے خصوصی پیغام میں ان کی ادبی و شعری خدمات کے ساتھ جمہوریت کے لئے جدوجہد کو بھی خوب سراہا ہے۔ "جریدہ" کے خصوصی نمبر کے بعد زیتون بانو اور تاج سعید نے اپنی مشترکہ کاوش کو کتابی شکل میں بھی "احمد فراز --- فن اور شخصیت" کے نام سے چھپوا دیا اس کتاب کی اشاعت کے کچھ ہی عرصہ بعد احمد فراز کو 1993-94ء کا "نقوش ایوارڈ" بہترین غزل و نظم کے لئے خطیر زرِ نقد کی صورت میں ملا۔ "نقوش ایوارڈ" ملنے کی دیر تھی کہ برسوں سے رکا ہوا 1989ء کا اکادمی ادبی ایوارڈ ان کے شعری مجموعے "پس انداز موسم" پر چالیس ہزار سکہ رائج الوقت کے ساتھ مل گیا۔ علامہ اقبال کے نام سے منسوب یہ ایوارڈ انھیں "ادیبوں اور دانشوروں کی قومی کانفرنس 94ء کے موقع صدر مملکت کے ہاتھوں ملا اور 14 اگست 94ء کو صدر مملکت کی جانب سے "پرائیڈ آف پرفارمنس" سے بڑا ایوارڈ "ستارۂ امتیاز" (لٹریچر) اناؤنس کیا گیا جو یہ 23 مارچ 95ء کو وصول کریں گے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے مختلف شعراء کو دیئے جانے والے ادبی انعامات کے سلسلے میں 1993ء کے شعری مجموعوں پر ایوارڈ کے انتخاب میں یہ جج بھی مقرر کئے گئے۔ اسی دوران دو تین روزنامہ اخباروں نے انھیں ایک سیکنڈل میں ملوث کر کے دو چار دن تک اخبار کی فروخت کا نیا ریکارڈ قائم کیا۔۔۔۔!

1994ء میں ملک اور بیرون ملک پذیرائی کا سلسلہ جاری رہا۔ بہت سے مشاعروں کی صدارت کی۔ خصوصی شامیں ان کے ساتھ منائی گئیں۔ بہت سی تقریبات کے مہمان خصوصی قرار پائے۔ "شام ہمدرد" 94ء میں پورے سال "وثیقۂ اعتراف" حاصل کرنے والے دس شعرائے راولپنڈی و اسلام آباد کے ساتھ مجموعی شام کی بھی انھوں نے صدارت کی۔ مری میں لٹریری سرکل کے تحت شامِ فراز منائی گئی۔ لندن، امریکہ، دبئی، شارجہ، قطر اور نجانے کہاں کہاں ان کے ساتھ سال 95ء کے آغاز میں سالگرہ کی تقریبات اور کئی "جشن فراز" منعقد ہوئے۔ "کیڈٹ کالج کوہاٹ" میں "فراز ڈے" منایا گیا اور کالج کی تاریخ میں پہلی بار کسی شاعر کی اس قدر پذیرائی کی گئی۔ خوبصورت سوو۔ سنِر بھی پیش کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو کوہاٹ نے بھی "جشن فراز" منایا۔ گلپاشی اور چادر پوشی کی اور پھر عظیم الشان کل پاکستان مشاعرے کی صدارت کرائی۔ ابھی یہ سلسلہ جاری ہے اس لئے اس سارے پس منظر میں کون کہہ سکتا ہے کہ غالب کے دیوان سے نکالی گئی فال درست نہ تھی کہ ع

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔

حال ہی میں انھیں کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری جامعہ کراچی سے گورنر سندھ محمود ہارون صاحب کے ہاتھوں ملی۔

جنوری 1994ء سے اب تک کی ادبی فتوحات سے قطع نظر احمد فراز مستقل طور پر ایک ادبی فاتح، کی حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے۔ اتنا کچھ کہ خود شاعری ان کی نازبرداری کرتی ہے۔ میرے نزدیک احمد فراز عہد موجود میں اردو غزل کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ اس بڑائی پر بھی وہ مغرور نہیں۔ شکر گزار ہیں۔۔۔ اظہار تشکر و امتنان یوں کرتے ہیں۔

اور فرازؔ چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

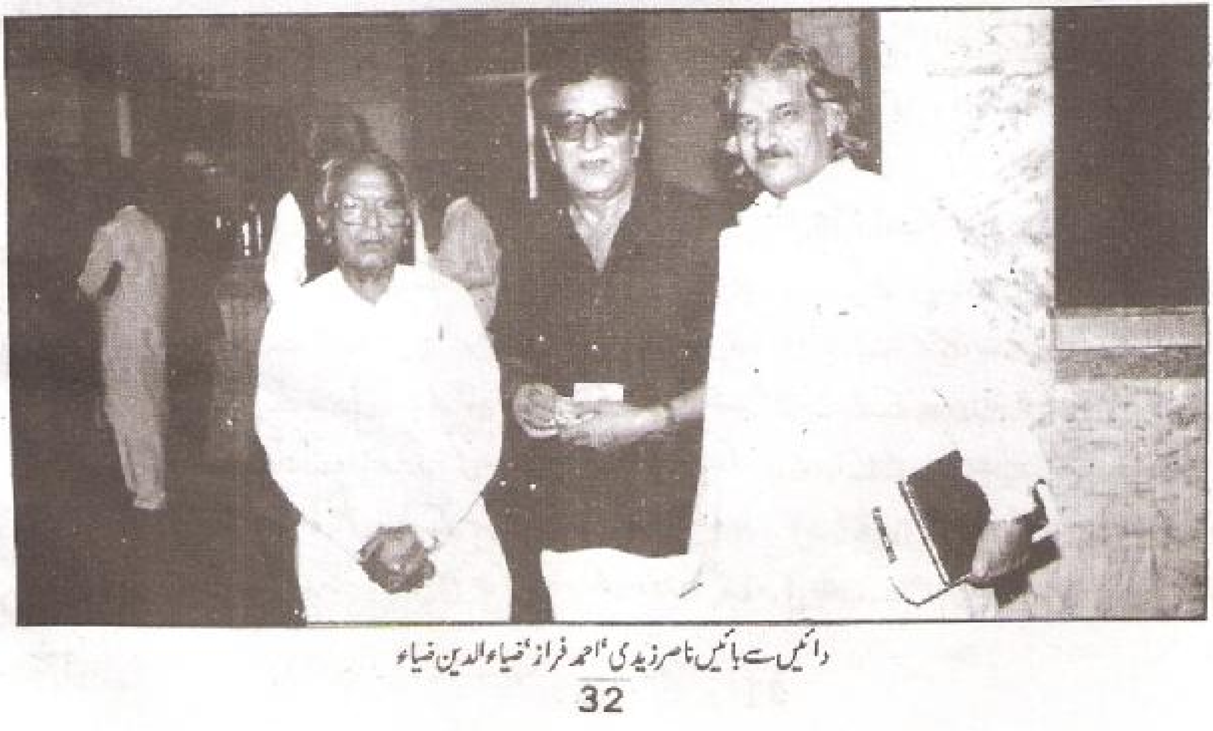

دائیں سے بائیں ناصر زیدی، احمد فراز، ضیاء الدین ضیاء

"اِک طائرِ خوش رنگ"

(کچھ فراز صاحب کی شخصیت کے بارے میں)

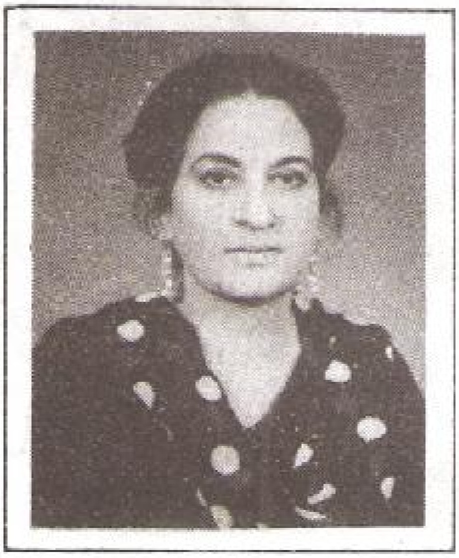

شبنم شکیل

خواتین و حضرات اللہ تعالیٰ جب کسی کو نوازنے پر آتا ہے تو اسکی کوئی حد مقرر نہیں کرتا۔ فراز صاحب کے معاملے میں اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اتنی نوازشیں کیں کہ لوگوں کے آئیڈیل تو یہ تھے ہی رفتہ رفتہ ایک "Legend" کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ دراصل ایسا ہوا کہ ذہانت اور خوبصورتی جو کہ ایک بہت ہی "Rare Combination" ہے وہ انھیں بخش دیا گیا۔ ان دونوں خصوصیات کی بنا پر انھیں جو فائدے ہوئے وہ تو یہ جانیں مگر ان کے ہم عصروں کو کہ جن میں میں بھی شامل ہوں، خاصا نقصان ہوا وہ یوں کہ شاعر ہونے کے ناطے ادبی اور نجی محفلوں اور مشاعروں میں انکی ہمراہی ناگزیر ہو گئی اور لوگوں نے اس مہر تاباں کی موجودگی میں دوسروں کے رنگ پھیکے پڑتے دیکھے۔ بھلا ان کے ہوتے کسی کا دیا کیا جلے۔ یہ بات میں نے اکثر و بیشتر فراز صاحب سے کی بھی ہے مگر انہوں نے ہر دفعہ کمال سادگی سے جواب دیا۔ "شبنم ایسی کوئی بات نہیں۔ ہر شاعر کا اپنا مقام ہوتا ہے۔ جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے"۔ چلئے بات ختم ہوئی۔ شائد بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ فراز صاحب اپنی تعریف سننے کے معاملے میں بہت شرمیلے ہیں۔ جیسے ہی کوئی تعریفی کلمات کہنا شروع کرتا ہے یہ بات بدل دیا کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میرے ہاں یہ بہت سے لوگوں کی موجودگی میں اشعار سنا رہے تھے پوری محفل مسحور تھی۔ میں نے کہا "فراز صاحب دیکھئے میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ آپکے ہم عصروں میں سے ہوں اور آپکے عہد میں زندہ ہوں" اردو شاعری کی تاریخ میں میرا نام آپکے کے ساتھ لیا جائے گا" باقی لوگوں نے تو ان جملوں پر واہ واہ کی مگر فراز صاحب نے اس کے جواب میں کہا "بھئی وہ چائے کہاں ہے جو تم میرے لئے ابھی لانے والی تھیں فراز صاحب کی طبیعت کی ایک اور خصوصیت حق گوئی و بے باکی" بھی ہے۔ جو آپکو صرف انکی شاعری ہی میں نہیں ملتی بلکہ ان کی ذات میں بھی اس کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار تکالیف بھی اٹھائی ہیں اور کئی جھگڑے بھی مول لئے ہیں۔ مگر شائد سرحد کے اس سپوت نے قسم کھا رکھی ہے کہ سچی بات کہنے سے باز نہیں آنا خواہ کتنا ہی "بھانبھڑ" کیوں نہ مچے۔ مصلحت کا خانہ انکے ہاں خالی ہے۔ کبھی سوچا کرتی تھی کہ اتنا کھرا آدمی اس دنیا میں Survive کیسے کرتا ہے لیکن پھر اسکی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ وہ یہ کہ اس مصلحت کیش معاشرے میں ان کا Survival بھی محض اور محض اللہ کی مہربانی سے ہی ممکن ہوا ہے۔ خدا ان پر اتنا مہربان کیوں ہے۔ اسکی صحیح وجہ تو خدا ہی جانتا ہے مگر جو کچھ میں سمجھی ہوں وہ انکی دو ایسی خصوصیات ہیں کہ جنھیں یقیناً اللہ پسند کرتا ہے۔ ایک تو کسی کی غیبت سے احتراز اور دوسرے بزرگوں کا احترام میں پچھلے تیس برس سے فراز صاحب کی ان دو خوبیوں کی گواہ ہوں۔ دعا مانگتی ہوں کہ ان کی یہ دو خوبیاں ہمیشہ قائم رہیں اللہ تعالیٰ ان پر ہمیشہ اسی طرح سے مہربان رہے یہ شہرت، عزت، مقبولیت اور محبت کے راج سنگھاسن پر ہمیشہ اسی طرح سے براجمان رہیں اور انکی شاعری یونہی زندہ و تابندہ رہے!

احمد فراز

حسن عباس رضا

احمد فراز، ٹین ایجرز کا شاعر ہے۔

احمد فراز، جذباتی جوانیوں اور عشق کی چوٹ کھائی ہوئی استانیوں کا شاعر ہے۔

احمد فراز، جذباتیت اور رومانویت کا شاعر ہے۔

احمد فراز، Snobb شخص ہے۔ احمد فراز مغرور آدمی ہے۔

احمد فراز، یہ ہے اور احمد فراز وہ ہے۔

غرض ایسے بے شمار طعنوں اور اس جیسے لاتعداد الزامات کے تیر احمد فراز کے ہمعصر حاسدوں نے اس کی طرف برسائے طعن و تشنیع اور جلن کے ان گنت جملے اس کی طرف اچھالے، مگر اس کا کوئی بھی ہمعصر شاعر نہ احمد فراز کی فنی عظمت کی گرد کو پہنچ سکا، اور نہ کسی میں اتنا کمال تھا کہ وہ فراز اور اس کے عروج کے چاند کو گہنا سکے۔ احمد فراز کے شعری سفر کا آفتاب گزشتہ ربع صدی سے اور آج بھی اسی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے جاوداں سخن کی کرنیں لٹا رہا ہے۔

بلاشبہ احمد فراز اس عہد کا سب سے بڑا، اور خوبصورت شاعر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ عہد میں اردو کی شعری عمارت کو سجانے اور سنوارنے میں فیض احمد فیض اور ن۔ م۔ راشد کی شاعری نے بنیادی اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اور انہی دو بڑے شاعروں نے نہ صرف احمد فراز کی شاعری کو بے حد سراہا، بلکہ انہیں اردو شاعری کا روشن مستقبل کہا ہے۔ سو میرے اس دعوے کا اس سے زیادہ معتبر حوالہ اور مستند ثبوت کیا ہو سکتا ہے۔

گزشتہ برس دلی کے مشاعرے میں احمد فراز جب اپنی مشہور اور اس وقت کی تازہ ترین غزل۔

سنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں

سنا رہے تھے۔ تو ہزاروں کی تعداد میں بیٹھے سامعین جس انداز جس خلوص اور محبت اور وارفتگی سے ایک ایک مصرعے اور شعر پر داد دے رہے تھے۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ علی سردار جعفری، اس مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے۔ جب وہ آخر میں اپنا کلام سنانے آئے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ "گزشتہ پچاس برس سے آج تک اتنی خوبصورت، مرصع، اور بھرپور غزل کسی نے نہیں کہی۔ جیسی احمد فراز کہہ گئے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ احمد فراز کی یہ ایک غزل پوری اردو شاعری کے مستقبل کو روشن تر اور تابناک رکھ سکتی ہے۔"

یہ ایک بڑے شاعر کا ایک دوسرے بڑے شاعر کو خراج تحسین تھا۔ اس وقت اپنے پاکستانی ہونے اور احمد فراز کا دوست کہلانے پر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اہل کوہاٹ کو بھی اپنے اس سپوت پر بے پناہ مان ہو گا۔ وہ کوہاٹ جس کی زمین نے احمد فراز جیسے شاعر کو جنم دیا۔ جس کی ہواؤں اور فضاؤں میں احمد فراز کی اولین محبتوں اور سانسوں کی مہک رچی بسی ہے۔ وہ کوہاٹ جس کی مٹی میں اس کے پیاروں اور دلاروں کی امانتیں دفن ہیں۔ اسی کوہاٹ نے آج اپنے بیٹے کے اعزاز میں جشن برپا کر کے اپنی محبتوں کا حق ادا کر دیا۔ گو کہ عقیدت کا یہ اظہار تاخیر سے ہوا۔ مگر خیر

محبت احمد فراز کی شاعری کا بنیادی استعارہ ہے اور اس بارے میں حاسدان فراز بھی اختلاف نہیں کرتے۔ مگر فراز کی شاعری کا ایک اور اہم پہلو جس سے اس کے حاسد قصداً پہلو تہی کرتے رہے۔ وہ ہے جبر اور استحصال کے خلاف احمد فراز کی موثر اور توانا آواز۔ احمد فراز پر محض رومانی شاعر ہونے کا الزام لگانے والے شاید بھول جاتے ہیں کہ اس کی پہلی کتاب کی پہلی نظم "شاعر" ہی احمد فراز کی مملکت سخن کا منشور ہے۔ اسی طویل نظم کا پہلا اور آخری بند حاسدان فراز اور محبان فراز کے لئے۔

جس آگ سے جی آج جل اٹھا ہے اچانک
پہلے بھی مرے سینے میں بیدار ہوئی تھی
جس کرب کی شدّت سے مری روح ہے بیکل
پہلے بھی مرے ذہن کا آزار ہوئی تھی
جس سوچ سے میں آج لہو تھوک رہا ہوں
پہلے بھی مرے حق میں یہ تلوار ہوئی تھی
اور آج شکستہ ہوا ہر طوقِ طلائی
اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے
اب میرا ہنر ہے مرے جمہور کی دولت
اب میرا جنوں خائفِ تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

اور میں سمجھتا ہوں کہ احمد فراز نے اپنی پہلی نظم شاعرے لیکر محاصرہ اور شہر آشوب تک کے طویل عرصے میں کہیں بھی اپنے منشور اور کمٹمنٹ سے روگر دانی نہیں کی اور اس جذبے اور صداقت فن کا پرچم کبھی بھی اپنے ہاتھوں سے گرنے نہیں دیا۔ اور یہی احمد فراز کے عظیم فن اور سچی شاعری کی روشن دلیل ہے۔

مجھے اپنے آپ سے ہمیشہ یہی گلہ رہا ہے کہ احمد فراز سے اس قدر زیادہ قربت اور ان کا دوست اور مداح ہونے کے باوجود میں آج تک فراز صاحب کے فن اور ان کی شخصیت کے شایان شان مضمون کیوں نہیں لکھ پایا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ ان کی محبت اور پیار اس قدر زیادہ ہے کہ ان کے بارے میں بہت کچھ کہا بھی کم لگتا ہے۔ اور پھر اس سے زیادہ کہنے کے انتظار میں ان کی رفاقت اور محبتیں مزید سمیٹنے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ خیر وہ دن ضرور آئے گا۔ جب میں اپنے محسن اپنے ممدوح اور اپنے دوست کے بارے میں بھرپور انداز سے کچھ لکھ سکوں گا۔ احمد فراز' میرے نزدیک ایک مہربان اور محبت کرنے والی شخصیت اور ایک انتہائی خوبصورت شاعر ہے۔ دوستی اور اخلاص کا ایک ایسا استعارہ ہے۔ جو محبتوں کی ورق ورق کہانیوں پر زندہ کرداروں کی طرح ہمیشہ جگمگاتا رہتا ہے۔

فراز صاحب سے میری دوستی اور محبت کا رشتہ سولہ سترہ برس کے عرصے پر پھیلا ہوا ہے۔ مگر اس رشتے کے اخلاص کا زمانہ کئی زمانوں سے بھی زیادہ طویل اور لا محدود ہے۔ محبتوں کے اس رشتے کی کہانیاں اور واقعات اور فراز صاحب کی خوبیاں بیان کرنے لگوں تو زمانے بیت جائیں۔ مگر فسانے ختم نہ ہوں۔ سو تنگئ وقت بھی میرے پیش نظر ہے اور دوسرے احباب کے اظہار عقیدت کا خیال بھی لہٰذا صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا۔ کہ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ کہ میں عہد فراز میں جی رہا ہوں۔ مجھے فراز کی دوستی اس کی محبت اور اس کی شاعری پر مان ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آنے والے سارے زمانے احمد فراز کی شاعری پر فخر کرتے رہیں گے۔

احمد فراز علی سردار جعفری کے ساتھ

کل نالۂ قمری کی صدا تک نہیں آئی
کیا ماتمِ گل تھا کہ صبا تک نہیں آئی

آدابِ خرابات کا کیا ذکر یہاں تو
رندوں کو بہکنے کی ادا تک نہیں آئی

کچھ ایسے مسیحا کے تغافل کا گلہ کیا
ہم جیسوں کی پرسش کو قضا تک نہیں آئی

جلتے رہے بے صرفہ چراغوں کی طرح ہم
تو کیا ترے کوچے کی ہوا تک نہیں آئی

کس جادہ سے گزرا ہے مگر قافلۂ عمر
آوازِ سگاں، بانگِ درا تک نہیں آئی

کلام خود بہ قلم خود

۱۴ فروری ۹۵

تازہ کلام

○

جس کے لیئے ہیں جاں بلب اُس کو نہیں ملال بھی
اے دلِ ناصبور اب عادتِ ہجر ڈال بھی

دامنِ یار تک کہاں عشقِ زبوں کی دسترس
حشمتِ حسن دیکھ کر بھول گیا سوال بھی

کب سے ہیں لوگ سر بکف مثلِ غزال و آہواں
اب تو مرے شکار خُو تیرو کماں سنبھال بھی

جس کے بغیر روز و شب سخت بھی تھے محال بھی
اسکے بغیر کٹ گئے کسطرح ماہ و سال بھی

انجم و مہر و ماہتاب سرو و صنوبر و گلاب
کس سے تجھے مثال دوں ہو تو کوئی مثال بھی

اسکے خرام ناز سے ایسی قیامتیں اُٹھیں
اب کے تو مات کھا گئی چرخِ کہن کی چال بھی

ہم کو تو عمر کھا گئی خیر ہمیں گلا نہیں
دیکھ تو کیا سے کیا ہوئے یار کے خدو خال بھی

اب کے فراز وہ ہوا جس کا نہ تھا گماں تک
پہلی سی دوستی تو کیا ختم ہے بول چال بھی

○

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
اُن سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

اب مہ و سال کی مہلت نہیں ملنے والی
آنے والے ہیں شب و روز عذابوں والے

اب تو سب دشنہ و خنجر کی زباں بولتے ہیں
اب کہاں لوگ محبت کے نصابوں والے

جو دلوں پر ہی کبھی نقب زنی کرتے تھے
اب گھروں تک چلے آئے وہ نقابوں والے

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں
فاختاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

نہ مرے زخم کھلے ہیں نہ تیرا رنگِ حنا
موسم آئے ہی نہیں اب کے گلابوں والے

یوں تو لگتا ہے کہ قسمت کا سکندر ہے فرازؔ
مگر اطوار ہیں سب خانہ خرابوں والے

○

دل گنوایا ہے جان ہاری ہے
یہ بھی کیسی وفا شعاری ہے

پھر اسی بےوفا سے یاری ہے
"پھر وہی زندگی ہماری ہے"

زیست تھی یا کوئی فراق کی رات
جانے گزری ہے یا گزاری ہے

تھا کبھی لازمی نصابِ وفا
اب یہ مضمون اختیاری ہے

زندگی ہے کہ بےوفا محبوب
جتنی ظالم ہے اتنی پیاری ہے

ایک دنیا فراز کو چاہے
اور احمد ترا پجاری ہے

ق

اب کے شہر جمال میں سب نے
اپنی اپنی دکان سنواری ہے

کہیں افسوں طراز حلقۂ زلف
کہیں قامت کی سحر کاری ہے

صف مژگاں نہیں ہے ترکش ہے
خم ابرو نہیں کٹاری ہے

قیمت یک نظر ہے دانش و دیں
نرخِ یک زخم عمر ساری ہے

ایسے ایسے جنوں فروش بدن
دل کی حکمت سے عقل عاری ہے

ایسے قاتل کہ داد خواہوں نے
نذرِ جاں سے نظر اتاری ہے

ایسے خوشرو کہ پارسائی بھی
الحذر الاماں پکاری ہے

ان کو دیکھے تو خضر بھی یہ کہے
خود کشی زندگی سے پیاری ہے

◆

◆

جب سے زخم فراق اس نے دیا
پھر کسی سے نہ ہم نے عہد کیا

زندگی ہم سے میکشوں کے لئے
ایک ساغر تھا پی کے توڑ دیا

میں نے غالب کی شاعری کی طرح
اس کے سارے بدن کو حفظ کیا

عشق سوداگری نہیں پیارے
جا تجھے خونبہا بھی بخش دیا

وہ مجھے کور چشم کہتا ہے
میں نے جس جس کو بھی چراغ دیا

کیا کہوں اے قرارِ جان فراز
تو نے کتنا مجھے اداس کیا

موسم اور محبت

گو شام نہیں تھی سردیوں کی
پھر بھی کمرہ خنک خنک تھا
کافی کی پیالیاں تہی تھیں
خالی خالی وجود تک تھا

ماضی کے گلے نہ عہد فردا
الفاظ گری نہ حرف گوئی
موسم نہ ادب نہ دل نہ دنیا
موضوع سخن نہیں تھا کوئی

اعصاب پہ برف گر رہی تھی
دونوں تھے خموش و دل گرفتہ
لگتا تھا مجسموں کی صورت
ہم جیسے ہوں روبرو نشستہ

دونوں کے بدن میں کپکپی تھی
سردی نے یہ حال کردیا تھا
چارہ ہی نہ تھا سو میں نے اس کو
اور اس نے مجھے پہن لیا تھا

تنہا، تنہا

بانو کے نام[٭]

ملوکیت کے محل کی گنہگار کنیز
وہ جُرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی
وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف
تری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی
وہ کون سا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب
ہر ایک جبر کو تُو سہہ گئی بطیبِ دلی

یہی سُنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا
کہ تُو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے
تری نظر نے وہ خلوت کدوں کے داغ گنے
جو خواجگی نے زر و سیم میں چھپانے تھے
تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اِس خطا کی سزا
ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

یہ رسمِ تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش
مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہُوئی
ہمیشہ اُونچے محلات کے بھرم کے لیے
ہر ایک دَور میں تزئینِ طوق و دار ہُوئی
کبھی چُنی گئی دیوار میں انار کلی
کبھی شکُنتلا پتھراؤ کا شکار ہُوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر
مؤرخین کی نظروں میں بے گناہ رہے
بہ فیضِ وقت اگر کوئی راز کھُل بھی گیا
زمانے والے طرفدارِ کجکلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

[٭] وہ کم سن کنیز جسے بیگم جونا گڑھ نے قتل کروا دیا۔

لختئی *

اَدھ کٹے بالوں پہ افشاں کے ستارے لرزاں
کُھردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں
سرد و بے جان سے چہرے پہ تھرکتی آنکھیں
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں

ٹُوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام اُمنگ
کسی سُوکھی ہُوئی ٹہنی کا جھکاؤ جیسے
لڑکھڑاتے ہُوئے قدموں کی گراں رفتاری
خشک ہوتی ہُوئی ندّی کا بہاؤ جیسے

رقص کرتی ہوئی پشواز پہ باہوں کی اُڑان
بادباں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں
یا کسی جھیل میں کنکر کے گرا دینے سے
چند لمحوں کے لیے دائرے بن جاتے ہیں

گرد آلود سے ماتھے پہ پسینے کی نمی
ریگزاروں سے عرق پُھوٹ رہا ہو جیسے
جھنجھناتے ہُوئے ہر گام پہ پیلے گھنگرو
دُور اک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں، خاک بہ رُخ، نالہ بلب
منجمد، ساکن و حیران ہیولے کی طرح
چند تانبے کے تراشے ہُوئے سکّوں کے عوض
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

---

* سرحد کے وہ رقّاص لڑکے جو بیاہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا روپ بنا کر ناچتے ہیں۔

( )

تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لیے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اُٹھیں کہ سورج بجھ گئے
ہائے وہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

مدتیں گزریں اِسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ ناواقف ، فضا بیگانہ ، ہم نا آشنا

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خلقِ شبنم کے لیے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم لیکن فراز
دوست دشمن کا نکل آیا ہے اپنا آشنا

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سُورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بُجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دُور ہُوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھڑک اُٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دِکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بُجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بے درد ہُوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

دوست بن کر بھی نہیں، ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اُسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اُس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آجاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھُلا ہے اتنا
ہے وہی مجھ کو سرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلّف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فراز
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سُوکھے ہُوئے پھُول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہُوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو
نشّہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا!
دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں نہ وہ تو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبّت کا بھرم رکھ
تُو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جُدائی کا سبب ہم
تُو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اِک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں اُمیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

نایافت

روزنا جرمن نژاد

روزنا جرمن نژاد
اس کے ہونٹوں میں حرارت
جسم میں طوفاں
برہنہ پنڈلیوں میں آگ
نیت میں فساد
رنگ و نسل و قامت و قد
سرزمین و دین کے سب تفرقوں سے بے نیاز
ہر کسی سے بے تکلف ایک حد تک دلنواز
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس
روزنا جرمن نژاد
اور دیکھنے والوں میں سب
اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میگساری کے سبب
پیکرِ تسلیم و سراپا طلب
ان میں ہر اک کی متاعِ کُل
بہائے التفاتِ نیم شب

روزنا جرمن نژاد
اور اس کا دل زخموں سے چُور
اپنے ہمدردوں سے ہمسایوں سے دُور
گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
جنگ کے آتشکدے کا رزق کب سے بن چکے
ہر آہنی بازو کا خوں
ہر چاند سے چہرے کا نور

خلوتیں خاموش و ویراں
اور ہر دہلیز پر اک مضطرب مرمر کا بُت
ایستادہ ہے بچشمِ ناصبور
کون ہے اپنوں میں باقی
توسنِ راہِ طلب کا شہسوار
ہر دریچے کا مقدر انتظار

اجنبی مہماں کی دستکِ خواب
شاید خواب کی تعبیر بھی
چند لمحوں کی رفاقت جاوداں بھی
حسرتِ تعمیر بھی
الوداعی شام، آنسو، عہد و پیماں
مضطرب صیّاد بھی نخچیر بھی

کون کر سکتا ہے ورنہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہماں کا اک حرفِ وفا

نومید چاہت کا غرور
روزنا اب اجنبی کے ملک میں خود اجنبی
پھر بھی چہرے پر اُداسی ہے نہ آنکھوں میں تھکن
اجنبی کا ملک جس میں چار سُو
تاریکیاں ہی خیمہ زن
سب کے سایوں سے بدن
روزنا مرمر کا بُت
اور اس کے گرد
ناچتے سائے بہت
سب کے ہونٹوں پہ وہی حرفِ وفا
ایک سی سب کی صدا
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس
اس آنکھوں میں تجسّس اور بس

* * *

○

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تجھ کو نہ آئیں محبتیں کرنی

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جُدائی کی ساعتیں کرنی

کوئی خدا ہو کہ پتھّر جسے بھی ہم چاہیں
تمام عمر اُسی کی عبادتیں کرنی

سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی

ہم اپنے دل سے ہیں مجبور اور لوگوں کو
ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی

ملیں جب اُن سے تو مبہم سی گفتگو کرنا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نباہتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

کبھی فراز نئے موسموں میں رو دینا
کبھی تلاش پُرانی رفاقتیں کرنی

کُشتان بی بی[٭]

تو جب
بسبریت کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے

تو یہ جانا
کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی جسم شل
اعضاء تھکن سے چُور
لیکن سب
ہراسِ مرگ سے بے جان — بے حس تھے
سبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر
رُوحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں یکجا ہیں
ضیا ، باسط ، سعید اور میں

ہمارا میزباں کب سے نہ جانے
گھر کے دروازے کُھلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پُل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا
ہم اجنبی مہماں
سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اِس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں

چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک و عود و مُر کی خوشبوؤں سے
چُور بوجھل

طائرانِ خوشنما و خوش نوا — بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتھروں کا نیلم و یاقوت سا جھل بل
ادھر کچھ دور بُزغالوں کے گلے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا
فضا حیرت فزا — سحر آفریں دنیا
"مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را"

[٭] کافرستان کی ایک لڑکی

ہمارا میزباں مفلس تھا
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر
ہم نحس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالۂ بریاں
بطک میں آبِ ناک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ میں دہکتی آگ
کتنی گرم کتنی خوبصورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینی خلد کی حوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی
الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
نیم ملبوس میں لپٹے ہوئے
مرمر کے بت
مہتاب سے پیکر
سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جھنباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پاکوباں
دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں
آہستہ آہستہ
کھنکتے قہقہے — محجوب آوازیں بھی
شامل ہوگئیں آخر
کہ جیسے نقرئی گھنگرو
اچانک جھنجھنا اٹھیں
سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
مگر وہ سرگروہِ نازنیناں
غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں
کشان بی بی
قد و قامت قیامت
جنبشیں جادو
بدن طوفاں

ضیا کردار میں گوتم
مجسّم صدق و ایثار و وفا
درد آشنا و نفس کُش ہمدم
لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں
مگر باسط جو اک فنکار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہر دم
قلم اس کا دُر افشاں و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے اپنے آپ سے نالاں
یہاں دنیا کے غم بھولا ہُوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں
سعید اک کم نظر جذبات کا پُتلا
مہندس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا
کئی تحفے
ملمع کی ہُوئیں انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام پر نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
ہیں بُت
کشان بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل
لذتِ معنی سے نامحرم
زبانِ یار کیلاشی و ما از حرفِ بیگانہ
(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)

کشان بی بی یہ کہتی ہے
مرے محبوب تو اک دستۂ مُر ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لُٹاتا ہے
مری ہمجولیو !
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ
مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اُس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنین
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا
بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اُٹھی
اے کوہساروں کی چکوری
تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے
آ مرے ہمراہ چل پیاری

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تل کی طرح
وہ کافرستان کی قلوپطرہ
مگر ہم میں کوئی سیزر نہ انتونی
ضیا گوتم سہی
لیکن کشن بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے
نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشان بی بی
سیہ ملبوس میں لپٹی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہُوئی ہم سے
بصد اندازِ استغنا و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

◆

ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

کہاں سے لائیں اب آنکھیں اُسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی اندازِ مخلصانہ وہ

جو ابر تھا تو اُسے ٹوٹ کر برسنا تھا
یہ کیا کہ آگ لگا کر ہُوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے توسنِ ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اُسے رُلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ گیا یاد کیا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا، نظر آیا نگار خانہ وہ

فراز خواب سی دُنیا دکھائی دیتی ہے
جو لوگ جانِ جہاں تھے ہُوئے فسانہ وہ

جاناں جاناں

* * *

طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت
ہم نے چھوڑا شہرِ رسوائی درِ جاناں سمیت
اس قدر افسردہ خاطر کون محفل سے گیا
ہر کسی کی آنکھ پُرنم ہے دل آزاراں سمیت
اِک فقیہہِ شہر کو کیا دوش دیجے جب سبھی
میکدے کے دشمنوں میں ہیں قدح خواراں سمیت
جشنِ مقتل تھا بپا اور صرف بسمل تھے ہمیں
ہم نے سوچا تھا کہ دیکھیں گے یہ دن یاراں سمیت
یہ رعونت تا بکے اے دل فگاراں دیکھیے
اب گرے گا طرۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت
وہ تو کیا آتے شبِ ہجراں تو کیا کٹتی فراز
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغِ جاں سمیت

* * *

یہ میری غزلیں، یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ اُن زمانوں کی ساعتیں ہیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دُکھ تھے یہ مانتا ہُوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہُوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت چھانتا ہُوں

وہ تیرا شاعر ترا مغنی
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں
تو ایک اِک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ اپسرائیں

مگر ہر اِک بار تجھ کو چھُو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہُوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دیوانہ
بہت دنوں کا اُجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اُسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دُکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

○

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

— ق —
اوّل اوّل کی محبت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدّتوں سے یہی عالم نہ توقّع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جُدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہُوا داخلِ زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہُوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہُوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہُوئے اوراقِ پریشاں جاناں

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبت نکل آئے

اب دل کی تمنّا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دیا گُل نہ کرو تم کہ نجانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شائد کہ تمھارا قد و قامت نکل آئے

* * *

○

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجا لی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مصحفِ رُخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے

وہ مروّت سے مِلا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فرازؔ
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

* * *

بے آواز گلی کوچوں میں

محاصرہ

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے
فصیلِ شہر کے ہر بُرج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وہ برق لہر بجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بچھا دیا گیا بارُود اُس کے پانی میں
وہ جُوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہُوئے
سپُردِ دار و رسن سارے سرکشیدہ ہُوئے

تمام صُوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوان کجکلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اُٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں

تُم اہلِ حرف کے پندار کے ثنا گر تھے
وہ آسمانِ ہُنر کے نجُوم سامنے ہیں
بس اِک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجُوم سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تُمھارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمانداروں کا
بس ایک تم ہو سو غیرت کو راہ میں رکھ دو
یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا

اُسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صُبح اِک نیا سُورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدُو کے لئے
کہ مُجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پہ گھمنڈ بہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصُور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا قلم نہیں اوزار اُس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اُس دزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لیے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!

◆

حرف کی شہادت

آؤ جس عیسیٰ کو ہم نے سُولی پر لٹکایا ہے
اُس کے لہو لہان بدن پر بین کریں
اور اشک بہائیں
فرض میں پُورے اُتر چکے
اب قرض چکائیں

اس کی گھڑاؤں وُہ لے جائے
جس نے صلیب بنائی تھی
چادر کا حقدار وُہی ہے
جس نے کیل لگائی تھی
اور کانٹوں کا تاج ہے اُس کا
جس کی آنکھ بھر آئی تھی

آؤ

اب ہم سب عیسیٰ ہیں
لوگوں کو بتلائیں
مُردوں کو زندہ کرنے کا
مُعجزہ بھی دکھلائیں
لیکن اُس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں؟

○

○

ہم سے کہیں کچھ دوست ہمارے مَت لِکھو
جان اگر پیاری ہے پیارے مَت لِکھو

حاکم کی تلوار مقدس ہوتی ہے
حاکم کی تلوار کے بارے مَت لِکھو

کہتے ہیں یہ دار و رسن کا موسم ہے
جو بھی جس کی گردن مارے مَت لِکھو

لوگ الہام کو بھی الحاد سمجھتے ہیں
جو دل پر وجدان اتارے مت لِکھو

وُہ لکھو بس جو بھی امیرِ شہر کہے
جو کہتے ہیں دَرد کے مارے مَت لِکھو

خُود مُنصف پابستہ ہیں لب بستہ ہیں
کون کہاں اَب عرض گزارے، مَت لِکھو

کچھ اعزاز رسیدہ ہم سے کہتے ہیں
اپنی بیاض میں نام ہمارے مَت لِکھو

دل کہتا ہے کھُل کر سچی بات کہو
اور لفظوں کے بیچ ستارے مَت لِکھو

○

عجب شہر تھے اور عجب لوگ تھے
ستم صُورتیں تھیں غضب لوگ تھے

فقیر اس گلی کے گداگر بنے
سراپا طلب بے طلب لوگ تھے

وُہ کافر اکیلا کھنچا دار پر
نمازِ جنازہ میں سب لوگ تھے

انھیں راستوں پر کلاہیں گریں
انھیں رہگزاروں میں جب لوگ تھے

نہ مقتل نہ میلا تماشا کوئی
مگر جا بجا بے سبب لوگ تھے

سبھی سر بہ سجدہ تھے دربار میں
ہم ایسے کہاں بے ادب لوگ تھے

فراز اپنی بربادیوں کا سبب
نہ اب لوگ ہیں اور نہ جب لوگ تھے

ہم اپنے خواب کیوں بیچیں

فقیرانہ روش رکھتے تھے
لیکن اس قدر نادار بھی کب تھے
کہ اپنے خواب بیچیں
ہم اپنے زخم آنکھوں میں لیے پھرتے تھے
لیکن رونقِ بازار ہم کب تھے
ہمارے ہاتھ خالی تھے
مگر ایسا نہیں پھر بھی
کہ ہم اپنی دریدہ دامنی
الفاظ کے جگنو
لیے گلیوں میں آوازہ لگاتے
"خواب لے لو خواب"
لوگو
اتنے کم پندار ہم کب تھے

ہم اپنے خواب کیوں بیچیں
کہ جن کو دیکھنے کی آرزو میں
ہم نے آنکھیں تک گنوا دی تھیں
کہ جن کی عاشقی میں
اور ہوا خواہی میں
ہر ترغیب کی شمعیں بجھا دی تھیں
چلو ہم بے نوا
محرومِ سقف و بام و در ٹھہرے
چلو ہم بد مقدر بے ہنر ٹھہرے
پر اپنے آسماں کی داستانیں
اور زمیں کے انجم و مہتاب کیوں بیچیں
خریدارو!
تم اپنے کاغذی انبار لائے ہو
ہوس کی منڈیوں سے درہم و دینار لائے ہو
تم ایسے دام تو ہر بار لائے ہو
مگر تم پر ہم اپنے حرف کے طاؤس
اپنے خون کے سرخاب کیوں بیچیں
ہمارے خواب بے وقعت سہی
تعبیر سے عاری سہی
پر دل زدوں کے خواب ہی تو ہیں
نہ یہ خوابِ زلیخا ہیں
کہ اپنی خواہشوں کے یوسفوں پر تہمتیں دھرتے

راشد

نہ یہ خواب عزیزِ مصر ہیں
تعبیر جن کی اس کے زندانی بیاں کرتے
نہ یہ اُن آمروں کے خواب
جو بے آسرا خلقِ خُدا کو دار پر لائیں
نہ یہ غارت گروں کے خواب
جو اوروں کے خوابوں کو تہہِ شمشیر کر جائیں
ہمارے خواب تو اہلِ صفا کے خواب ہیں
حرف و نوا کے خواب ہیں
مہجُور دروازوں کے خواب
محصُور آوازوں کے خواب
اور ہم یہ دولتِ نایاب کیوں بیچیں
ہم اپنے خواب کیوں بیچیں ؟

○

واپسی

اُس نے کہا
سُن
عہد نبھانے کی خاطر مت آنا
عہد نبھانے والے اکثر
مجبُوری یا مہجُوری کی تھکن سے لَوٹا کرتے ہیں
تم جاؤ
اور دریا دریا پیاس بجھاؤ
جن آنکھوں میں ڈُوبو
جس دِل میں بھی اُترو
میری طلب آواز نہ دے گی

لیکن جب میری چاہت
اور میری خواہش کی لَو
اتنی تیز اور اتنی
اُونچی ہو جائے
جب دِل رو دے
تب لَوٹ آنا

اس قدر مسلسل تھیں شدتیں جُدائی کی
آج پہلی بار اس سے میں نے بے وفائی کی

ورنہ اب تلک یُوں تھا خواہشوں کی بارش میں
یا تو ٹوٹ کر رویا یا غزل سرائی کی

تج دیا تھا کل جن کو ہم نے تیری چاہت میں
آج اُن سے مجبوراً تازہ آشنائی کی

ہو چلا تھا جب مجھ کو اختلاف اپنے سے
تُو نے کس گھڑی ظالم میری ہمنوائی کی

ترک کر چکے قاصد کوئے نامراداں کو
کون اب خبر لاوے شہرِ آشنائی کی

طنز و طعنہ و تہمت سب ہنر ہیں ناصح کے
آپ سے کوئی پُوچھے ہم نے کیا بُرائی کی

پھر قفس میں شور اُٹھا قیدیوں کا اور صیّاد
دیکھنا اُڑا دے گا پھر خبر رہائی کی

دُکھ ہوا جب اُس در پر کل فراز کو دیکھا
لاکھ عیب تھے اُس میں خُو نہ تھی گدائی کی

○

مرا ہی رنگ پریدہ ہر اک نظر میں رہا
وگرنہ درد کا موسم تو شہر بھر میں رہا

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مِل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

بہت سے لوگ تھے گھل مل کے سب سے باتیں کیں
وہ جس کو میں نے نہ دیکھا مری نظر میں رہا

کچھ اس طرح سے گزُاری ہے زندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا

وداعِ یار کا منظر فراز یاد نہیں
بس ایک ڈوبتا سُورج مری نظر میں رہا

پس انداز موسم

وہ لمحے کتنے دروغ گو تھے

تمہاری پوروں کا لمس اب تک
مری کفِ دست پر ہے
اور میں یہ سوچتا ہوں
وہ لمحے کتنے دروغ گو تھے
وہ کہہ گئے تھے
کہ اب کے جو ہاتھ تیرے ہاتھوں کو چھو گئے ہیں
تمام ہونٹوں کے سارے لفظوں سے معتبر ہیں
وہ کہہ گئے تھے
تمہاری پوریں
جو میرے ہاتھوں کو چھو رہی تھیں
وہی تو قسمت تراش ہیں
اور اپنی قسمت کو
سارے لوگوں کی قسمتوں سے بلند جانو
ہماری مانو
تو اب کسی اور ہاتھ کو ہاتھ مت لگانا
میں اس سمے سے
تمام ہاتھوں
وہ ہاتھ بھی
جن میں پھول
شاخوں سے بڑھ کے لطفِ نمو اٹھائیں
وہ ہاتھ بھی جو سدا کے محروم تھے
اور ان کی ہتھیلیاں زخم زخم تھیں
اور وہ ہاتھ بھی جو چراغ جیسے تھے
اور رستے میں سنگِ فرسنگ کی طرح جا بجا گڑے تھے
وہ ہاتھ بھی
جن کے ناخنوں کے نشان
معصوم گردنوں پر مثالِ طوقِ ستم پڑے تھے
تمام نامہربان اور مہربان ہاتھوں سے
دست کش یوں رہا ہوں جیسے
یہ مٹھیاں میں نے کھول دیں تو
وہ ساری سچائیوں کے موتی
مسرتوں کے تمام جگنو
گم
جو بے یقینی نے جنگلوں میں

یقین کا راستہ بناتے ہیں
روشنی کی لکیر کا قافلہ بناتے ہیں
میرے ہاتھوں سے روٹھ جائیں گے
پھر نہ تازہ ہوا چلے گی
نہ کوئی شمعِ صدا جلے گی
میں ضبط اور انتظار کے اس حصار میں مدتوں رہا ہوں
مگر جب اک شام
اور وہ پت جھڑ کی آخری شام تھی
ہوا اپنا آخری گیت گا رہی تھی
مرے بدن میں میرا لہو خشک ہو رہا تھا
تو مٹھیاں میں نے کھول دیں
اور میں نے دیکھا
کہ میرے ہاتھوں میں
کوئی جگنو
نہ کوئی موتی
ہتھیلیوں پر فقط مری نامراد آنکھیں دھری ہوئی تھیں
اور ان میں
قسمت کی سب لکیریں مری ہوئی تھیں

* * *

قربت بھی نہیں دل سے اُتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخمِ جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

وہ راحتِ جاں ہے مگر اس دربدری میں
ایسا ہے کہ اب دھیان اُدھر بھی نہیں جاتا

ہم دُوہری اذیّت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تری چاہت پہ بھروسہ بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فرازؔ اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا

* * *

شہر نامہ

(اجڑی کیمپ کے حوالے سے)

وہ عجیب صبحِ بہار تھی
کہ سحر سے نوحہ گری رہی
میری بستیاں تھیں دھواں دھواں
میرے گھر میں آگ بھری رہی

میرے راستے تھے لہو لہو
میرا قریہ قریہ فگار تھا
یہ کفِ ہوا یہ زمین تھی
وہ فلک کہ مشتِ غبار تھا

کئی آبشار سے جسم تھے
کہ جو قطرہ قطرہ پگھل گئے
کئی خوش جمال طلسم تھے
جنھیں گردباد نگل گئے

کوئی خواب نوکِ سناں پہ تھا
کوئی آرزو تہِ سنگ تھی
کوئی پھول آبلہ آبلہ
کوئی شاخ مرقدِ رنگ تھی

کئی لاپتہ میری لعبتیں
جو کسی طرف کی نہ ہو سکیں
جو نہ آنے والوں کے ساتھ تھیں
جو نہ جانے والوں کو رو سکیں

کہیں تارِ ساز سے کٹ گئیں
کسی مطربہ کی رگِ گلو
مئے آتشیں میں وہ زہر تھا
کہ تڑخ گئے قدح و سبو

کوئی نے نواز تھا دم بخود
کہ نفس سے حدتِ جاں گئی
کوئی سر بہ زانو تھا باربد
کہ صدائے دوست کہاں گئی

کہیں نغمگی میں وہ بین تھے
کہ سماعتوں نے سُنے نہیں
کہیں گونجتے تھے وہ مرثیے
کہ انیس نے بھی کہے نہیں

یہ جو سنگ ریزوں کے ڈھیر ہیں
یہاں موتیوں کی دکان تھی
یہ جو سائبان دھوئیں کے ہیں
یہاں بادلوں کی اڑان تھی

جہاں روشنی ہے کھنڈر کھنڈر
یہاں قمقموں سے جوان تھے
جہاں چیونٹیاں ہوئیں خیمہ زن
یہاں جگنوؤں کے مکان تھے

کہیں آبگینہ خیال کا
کہ جو کربِ ضبط سے چور تھا
کہیں آئینہ کسی یاد کا
کہ جو عکسِ یار سے دور تھا

مرے بسملوں کی قناعتیں
جو بڑھائیں ظلم کے حوصلے
مرے آہوؤں کا چکیدہ خوں
جو شکاریوں کو سراغ دے

کوئی تاجرِ حسب و نسب،
کوئی دیں فروشِ قدیم ہے
یہاں کفش بر بھی امام ہیں
یہاں نعت خواں بھی کلیم ہے

یہاں سب کے نرخ جدا جدا
اسے مول لو اسے تول دو
جو طلب کرے کوئی خوں بہا
تو دہن خزانے کا کھول دو

مری عدل گاہوں کی مصلحت
مرے قاتلوں کی وکیل ہے
مرے خانقاہوں کی منزلت
مری بزدلی کی دلیل ہے

کوئی فکر مند کلاہ کا
کوئی دعوٰی دار قبا کا ہے
وہی اہلِ دل بھی ہیں زیبِ تن
جو لباس اہلِ ریا کا ہے

وہ جو سر کشی کا ہو مرتکب
اسے قمچیوں سے زبوں کرو
جہاں خلقِ شہر ہو مشتعل
اسے گولیوں سے نگوں کرو

مرے اہلِ حرف و سخن سرا
جو گداگروں میں بدل گئے
مرے ہمصفیر تھے حیلہ جُو
کسی اور سمت نکل گئے

میرے پاسباں میرے نقب زن
مرا مُلک مِلکِ یتیم ہے
مرا دیس امیرِ سپاہ کا
مرا شہر مالِ غنیم ہے

مگر ایسے ایسے غنی بھی تھے
اسی قحط زارِ دمشق میں
جنھیں کوئے یار عزیز تھا
جو کھڑے تھے مقتلِ عشق میں

کئی فاختاؤں کی چال میں
مجھے کرگسوں کا چلن لگا
کئی چاند بھی تھے سیاہ رو
کئی سورجوں کو گہن لگا

جو روش ہے صاحبِ تخت کی
سو مصاحبوں کا طریق ہے
یہاں کوتوال بھی دُزدِ شب
یہاں شیخِ دیں بھی ہے

کوئی بانکپن میں تھا کوہکن
تو جنوں میں قیس سا تھا کوئی
جو صراحیاں لیے جسم کی
مئے نابِ خوں سے بھری ہوئی

تجھے صلا بلب کہ پیو پیو
یہ سبیل اہلِ صفا کی ہے
یہ کشید نوشِ بدن کرو
یہ کشید تاکِ وفا کی ہے

سو لہو کے جام انڈیل کر
مرے جانفروش چلے گئے
وہ سکوت تھا سرِ میکدہ
کہ وہ خم بدوش چلے گئے

کوئی تشنہ لب ہی نہ تھا یہاں
جو پکارتا کہ ادھر ادھر
سبھی مقتدر تھے تماش بیں
کوئی بزم میں کوئی بام پر

کوئی مجلسوں میں رسن بہ پا
کوئی مقتلوں میں دریدہ تن
نہ کسی کے ہاتھ میں شاخِ نے
نہ کسی کے لب پہ گلِ سخن

سبھی بے حسی کے خمار میں
سبھی اپنے حال میں مست تھے
سبھی رہروانِ رہِ عدم
مگر اپنے زعم میں ہست تھے

اسی عرصۂ شبِ تار میں
یونہی ایک عمر گزر گئی
کبھی روزِ وصل بھی دیکھتے
یہ جو آرزو تھی وہ مر گئی

یہاں روزِ حشر بپا ہوئے
پہ کوئی بھی روزِ جزا نہیں
یہاں زندگی بھی عذاب ہے
یہاں موت میں بھی شفا نہیں

اے میرے سارے لوگو

اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو
اس سے پہلے بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی
اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو
اس سے پہلے مری شہ رگ کا لہو چاٹ چکی

پھر وہی آگ در آئی ہے مری گلیوں میں
پھر مرے شہر میں بارود کی بو پھیلی ہے
پھر سے تو کون ہے میں کون ہوں آپس میں سوال
پھر وہی سوچ میان من و تو پھیلی ہے

مری بستی سے پرے بھی مرے دشمن ہوں گے
پر یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اُترا
آشنا ہاتھ ہی اکثر مری جانب لپکے
میرے سینے میں سدا اپنا ہی خنجر اُترا

پھر وہی خوف کی دیوار تذبذب کی فضا
پھر ہوئی عام وہی اہلِ ریا کی باتیں
نعرۂ حُبِّ وطن مالِ تجارت کی طرح
جنسِ ارزاں کی طرح دینِ خدا کی باتیں

اس سے پہلے بھی تو ایسی ہی گھڑی آئی تھی
صبحِ وحشت کی طرح شامِ غریباں کی طرح
اس سے پہلے بھی تو پیمانِ وفا ٹوٹے تھے
شیشۂ دل کی طرح آئینۂ جاں کی طرح

پھر کہاں احمریں ہونٹوں پہ دعاؤں کے دیے
پھر کہاں شبنمیں چہروں پہ رفاقت کی ردا
صندلیں پاؤں سے مستانہ روی روٹھ گئی
مرمریں ہاتھوں پہ جل بجھ گیا انگارِ حنا

دلنشیں آنکھوں میں فرقت زدہ کاجل رویا
شاخِ بازو کے لیے زلف کا بادل رویا
مثلِ پیراہنِ گل پھر سے بدن چاک ہوئے
جیسے اپنوں کی کمانوں میں ہوں اغیار کے تیر
اس سے پہلے بھی ہوا چاند محبت کا دونیم
نوکِ دشنہ سے کھچی تھی مری دھرتی پہ لکیر

آج ایسا نہیں ایسا نہیں ہونے دینا
اے میرے سوختہ جانو مرے پیارے لوگو
اب کے گر زلزلے آئے تو قیامت ہوگی
میرے دل گیر مرے درد کے مارے لوگو
کسی غاصب کسی ظالم کسی قاتل کے لیے
خود کو تقسیم نہ کرنا میرے سارے لوگو

* * *

○

آشنا کوئی سرِ شہرِ ستمگر نہ ملا
اب کے آئے تو کسی ہاتھ میں پتھر نہ ملا

سائے دشمن مری گلیوں کی کمیں گاہ میں تھے
کوئی لشکر بھی مجھے شہر کے باہر نہ ملا

ہم بھی پتھر تھے مگر کیسا مقدر لائے
سب خدا ساز ملے کوئی صنم گر نہ ملا

نظمِ میخانہ کچھ ایسا ہی رہا ہے کہ ہمیں
کبھی ساقی کبھی مینا کبھی ساغر نہ ملا

ہمیں محروم تھے ایسے کہ فقط تُو ہی نہیں
ہم جسے ڈھونڈنے نکلے وہی اکثر نہ ملا

دیکھ پندار ان آشفتہ سروں کا کہ جنہیں
بختِ منصور ملا، تختِ سکندر نہ ملا

اب جو تجدیدِ رفاقت ہے تو پھر ٹوٹ چکے دل
دل ہے آئینہ تو پھر ہاتھ جھجک کر نہ ملا

لاکھ بے مہر سہی دوست تو رکھتے ہو فراز
ان کو دیکھو کہ جنہیں کوئی ستمگر نہ ملا

○

خود کلامی میں کب یہ نشہ تھا
جس طرح رُوبرو کوئی ہے ابھی

اوّل اوّل کی دوستی ہے ابھی
اِک غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی

میں بھی شہرِ وفا میں نو وارد
وہ بھی رُک رُک کے چل رہی ہے ابھی

میں بھی ایسا کہاں کا زود شناس
وہ بھی لگتا ہے سوچتی ہے ابھی

دل کی وارفتگی ہے اپنی جگہ
پھر بھی کچھ احتیاط سی ہے ابھی

گرچہ پہلا سا اجتناب نہیں
پھر بھی کم کم سپردگی ہے ابھی

کیسا موسم ہے کچھ نہیں کھلتا
بوندا باندی بھی دھوپ بھی ہے ابھی

قربتیں لاکھ خوبصورت ہوں
دُوریوں میں بھی دلکشی ہے ابھی

فصلِ گل میں بہار پہلا گلاب
کس کی زُلفوں میں ٹانکتی ہے ابھی

صبحِ نارنج کے شگوفوں کی
کس کو سوغات بھیجتی ہے ابھی

رات کس ماہ وش کی چاہت میں
شبنمستاں سجا رہی ہے ابھی

میں بھی کس وادیٔ خیال میں تھا
برف سی دل پہ گر رہی ہے ابھی

میں تو سمجھا تھا بھر چکے سبھی زخم
داغ شاید کوئی کوئی ہے ابھی

دُور دیسوں سے کالے کوسوں سے
کوئی آواز آ رہی ہے ابھی

زندگی کوئے نامرادی ہے
کس کو مُڑ مُڑ کے دیکھتی ہے ابھی

اس قدر کھنچ گئی ہے جاں کی کماں
ایسا لگتا ہے ٹوٹتی سی ہے ابھی

ایسا لگتا ہے خلوتِ جاں میں
وہ جو اک شخص تھا وہی ہے ابھی

مدّتیں ہو گئیں فراز مگر
وہ جو دیوانگی کہ تھی، ہے ابھی

○

اے دیس سے آنے والے بتا

وہ شہر جو ہم سے چھُوٹا ہے اب اس کا نظارا کیسا ہے
ہر دشمنِ جاں کس حال میں ہے ہر جان سے پیارا کیسا ہے
سُنتے ہیں کہ سیلِ خوں آیا اور مثلِ شفق ہے رنگِ فلک
وہ سبز زمیں اب کیسی ہے وہ چاند ستارا کیسا ہے

شب بزمِ حریفاں جمتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
اب محفلِ یاراں کیسی ہے ہر انجمن آرا کیسا ہے
ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتی ہیں
جب سے وہ مسیحا دار ہوا ہر درد کا مارا کیسا ہے

کیا کوئے نگاراں میں اب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے
دل والوں نے قاتل کے لیے مقتل کو سنوارا کیسا ہے
کہتے ہیں کہ گھر اب زنداں ہیں کہتے ہیں زنداں مقتل ہیں
یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظُلم خدارا کیسا ہے

کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگھرو ہیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اب وقت کا دھارا کیسا ہے...
کیا پچھلے پہر اب بھی آنکھیں بھر آتی ہیں، کُرلاتی ہیں
ہر لختِ جگر پر کیا گزری ہر آنکھ کا تارا کیسا ہے

میخواروں کا پندار گیا میخانوں کا معیار گیا
کل تلخیٔ مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے
یہ شامِ ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بدقسمت لوگوں کی قسمت کا ستارا کیسا ہے

مہران لہو کی دھار ہُوا بولان بھی کیا گلنار ہُوا
کس رنگ کا ہے دریائے اٹک راوی کا کنارا کیسا ہے
پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت پوچھو
جاں ریزہ ریزہ کتنی ہے دل پارا پارا کیسا ہے

شب خون

اے مرے شہر!

"جنگ ۱۹۶۵ء میں ۱۳ ستمبر کو کوہاٹ پر بھارت کی
وحشیانہ بمباری کی وجہ سے بیشمار معصوم جانیں تلف ہوئی تھیں"

مرے شہر!
میں تجھ سے نادم ہوں
اِس خامشی کے لیے
جب عدو تیری خوابیدہ گلیوں پہ
بھیگی ہوئی رات میں
آگ برسا رہا تھا
میں چپ تھا

مرے شہر!
میں تیرا مجرم ہوں
اس بے حسی کے لیے
جب ترے بام و در
طاق و دہلیز و دیوار
تیرے مکینوں کے
خونِ حنا رنگ سے
تربتر ہو رہے تھے
تو میں چشم بستہ تھا

اے مرے آبا کے مسکن!
میں تیرا گنہگار ہوں
جب ترے آئینہ رنگ چشموں سے
اک جوئے خوں آ ملی تھی
تو میرے لبوں پہ
کوئی حرفِ ماتم نہ آیا
کہ جب تیرے زرتاب خرمن پہ
سفاک بجلی گری تھی
تو میں تیری جلتی ہوئی کھیتیوں کی طرف
با دلِ چاک و با چشمِ پُرنم نہ آیا

میں شرمندہ ہوں
اے مرے برگزیدہ بزرگوں کی بستی
کہ اِس درد کی فصل میں
تیرے فرزند شاعر کی نوکِ قلم پہ
ترا اسمِ اعظم نہ آیا

یہ سب کچھ بجا ہے —
یہ سب کچھ بجا ہے
مگر اے مقدس زمیں!
تیری مٹی نے جب میری صورت گری کی
تو ورثے میں تُو نے
مجھے ایسا دل دے دیا تھا
جو اپنے دُکھوں کے سمندر نہ دیکھے
مگر دوسروں کے نمِ چشم سے باخبر ہو
مجھے تیری گل نے وہ احساس بخشا
جو اپنے عزیزوں کی لاشوں پہ
پتھر بنا دم بخود ہو
مگر کاہشِ دیگراں پر
سدا نوحہ گر ہو

مرے شہر!
جب تیرے سینے سے
مینارِ خوں اُٹھ رہا تھا

میں اُس وقت
غافل نہیں تھا
میں بے حس نہیں تھا
مگر اُس گھڑی میرا سارا وطن
ظلم کی زد میں تھا
میرا سارا چمن
آگ کی حد میں تھا
ساری دنیا کی مظلومیت، میری آہوں میں تھی
ساری دنیا ہی میری نگاہوں میں تھی
اس سمے
تُو ہی تُو تھا
پشاور کا
لاہور کا
اور
بنگال کا نام، کوہاٹ تھا
کاشمیر
کوریا
ہیروشیما کا ویتنام کا نام، کوہاٹ تھا
ساری مظلوم دنیا کے ہر شہر کا نام کوہاٹ تھا
اے مرے شہر!
میرا قلم اپنے کردار پر
تجھ سے نادم سہی
خود سے نادم نہیں
تو مرا شہر ہے
پر مرا شہر تو آج ساری زمیں ہے
فقط تو نہیں ہے

* * *

اے وطن اے وطن

اے وطن اے وطن
اے وطن اے وطن
تیرے کھیتوں کا سونا سلامت رہے
تیرے شہروں کا سکھ تا قیامت رہے
تا قیامت رہے یہ بہارِ چمن
اے وطن اے وطن

تیرے بیٹے تری آبرو کے لیے
یوں جلائیں گے اپنے لہو کے دیے
پھُوٹ نکلے گی تاریکیوں سے کرن
اے وطن اے وطن

تیری آباد گلیاں مہکتی رہیں
تیری راہیں فضائیں چمکتی رہیں
یوں مسکراتے رہیں تیرے کوہ و دمن
اے وطن اے وطن
اے وطن اے وطن

خوابِ گُل پریشاں ہے

○

تُو جو چاہے تو نہیں ہوں تُو جو چاہے تو میں ہوں
میری اوقات ہی کیا ہے پر کا ہے تو میں ہوں

تیرے غم نے مری ہستی کی ضمانت دی تھی
تیرا غم اپنے تعلق کو نباہے تو میں ہوں

دل نے کب شیوہء دریوزہ گری ترک کیا
تیرے در پہ نہ ہوا میں سرراہے تو میں ہوں

جانے کیا رنگ دکھاتی ہے بہاراں اب کے
دل دریدہ و پریشان نگہ ہے تو میں ہوں

تو نہ مانے گا مگر خلوتِ دل میں تیری
یار! اکثر نہ سہی گاہے بگاہے تو میں ہوں

حیف اس فن پہ جو فنکار سے پہلے مر جاتے
وقت اگر کل بھی سخن میرے سراہے تو میں ہوں

اور کیا چاہیے اس فقر و فقیری میں فراز
صاحبِ خرقہ وہ پیوند کلاہے تو میں ہوں

اس نے سکوتِ شب میں بھی اپنا پیام رکھ دیا
ہجر کی رات بام پر ماہِ تمام رکھ دیا

آمدِ دوست کی نوید کوئے وفا میں گرم تھی
میں نے بھی اک چراغ سا دل سرِ شام رکھ دیا

شدتِ تشنگی میں بھی غیرتِ میکشی رہی
اس نے جو پھیر لی نظر میں نے بھی جام رکھ دیا

اُس نے نظر نظر میں ہی ایسے بھلے سخن کہے
میں نے تو اس کے پاؤں میں سارا کلام رکھ دیا
دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں
میں نے تو سب حسابِ جاں بر سرِ عام رکھ دیا

اب کے بہار نے بھی کیں ایسی شرارتیں کہ بس
کبکِ دری کی چال میں تیرا خرام رکھ دیا

جو بھی ملا اسی کا دل حلقہ بگوشِ یار تھا
اس نے تو سارے شہر کو کر کے غلام رکھ دیا

اور فراز چاہئیں کتنی محبتیں تجھے
ماؤں نے تیرے نام پر بچوں کا نام رکھ دیا

سُنا ہے لوگ اُسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اُس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے ربط ہے اُس کو خراب حالوں سے
سو اپنے آپ کو برباد کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے درد کی گاہک ہے چشمِ ناز اُس کی
سو ہم بھی اُس کی گلی سے گزر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کو بھی ہے شعر و شاعری سے شغف
سو ہم بھی معجزے، اپنے ہُنر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے بولے تو باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
یہ بات ہے تو چلو بات کر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے رات اُسے چاند تکتا رہتا ہے
ستارے بامِ فلک سے اُتر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے دن کو اُسے تتلیاں ستاتی ہیں
سُنا ہے رات کو جگنو گزر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے حشر ہیں اُس کی غزال سی آنکھیں
سُنا ہے اُس کو ہرن دشت بھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے رات سے بڑھ کر ہیں کاکلیں اُس کی
اُفق سے شام کے سائے اُتر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کی سیہ چشمگی قیامت ہے
سو اُس کو سُرمہ فروش آہ بھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کے لبوں سے گلاب جلتے ہیں
سو ہم بہار پہ الزام دھر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے آئینہ تمثال ہے، جبیں اُس کی
جو سادہ دِل ہیں اُسے بن سنور کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے جب سے حمائل ہیں اُس کی گردن میں
مزاج اور ہی لعل و گہر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے چشمِ تصوّر سے دشتِ امکاں میں
پلنگ، زاویے اُس کی کمر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اس کے بدن کی تراش ایسی ہے
کہ پھول اپنی قبائیں کتر کے دیکھتے ہیں

وہ سَرو قد ہے مگر بے گُلِ مُراد نہیں
سو اِس شجر پہ شگوفے ثمر کے دیکھتے ہیں

بس اِک نگاہ سے لُٹتا ہے قافلہ دِل کا
سو رہ روانِ تمنا بھی ڈر کے دیکھتے ہیں

سُنا ہے اُس کے شبستان سے مُتصل ہے بہشت
مکیں اُدھر کے بھی جلوے اِدھر کے دیکھتے ہیں

رکے تو گردشیں اُس کا طواف کرتی ہیں
چلے تو اُس کو زمانے ٹھہر کے دیکھتے ہیں

کسے نصیب کہ بے پیرہن اُسے دیکھے
کبھی کبھی درِ و دیوار گھر کے دیکھتے ہیں

کہانیاں ہی سہی سب مُبالغے ہی سہی
اگر وہ خواب ہے تعبیر کر کے دیکھتے ہیں

اَب اُس کے شہر میں ٹھہریں کہ کُوچ کر جائیں
فرازؔ آؤ ستارے سفر کے دیکھتے ہیں

○

رباعیات

لفظوں میں فسانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
لمحوں میں زمانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
تو زھر ہی دے شراب کہہ کر ساقی
جینے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ

○

یہ دور مے و جام چلے یا نہ چلے
نشے سے بھی پھر کام چلے یا نہ چلے
ہم اھل خرابات سے یوں بیر نہ رکھ
ساقی ترا کل نام چلے یا نہ چلے

○

خوابوں میں خیال کھو رہے ہوں جیسے
نشے میں زمانے سو رہے ہوں جیسے
سینے سے ڈھلک گیا ہے کس کا آنچل
خورشید طلوع ہو رہے ہوں جیسے

○

ہر غم کو دلآویز کئے دیتا ہوں
احساس کی لو تیز کئے دیتا ہوں
تو زلف کو کچھ اور پریشاں کر دے
میں جام کو لبریز کئے دیتا ہوں

یا اپنے رفیقانِ سفر سے کٹ جاؤ
یا سیلِ حوادث کے مقابل ڈٹ جاؤ
رستے کا غبار کیوں بنے ہو چھٹ جاؤ
جب بڑھ نہیں سکتے تو پرے ہٹ جاؤ

○

مذھب کو مدام بیچتے ہیں یہ لوگ
ایمان تو عام بیچتے ہیں یہ لوگ
جنت کے اجارہ دار بن کر شب و روز
اللہ کا نام بیچتے ہیں یہ لوگ

○

روتا ہوں تو احباب برا مانتے ہیں
ھنستا ہوں تو مجرم مجھے گردانتے ہیں
ہر حال میں اعتراض کرنے والے
ناداں مرے حالات کہاں جانتے ہیں

○

ہر بحرِ ستم کو پاٹ لینے والا
ہر زہرِ الم کو چاٹ لینے والا
ذرّے سے پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے
انسان پہاڑ کاٹ لینے والا

میرے خواب ریزہ ریزہ

روشنیوں کا شہر

منظوم ڈرامہ

پہلا منظر

(گھڑیال سات بجاتا ہے اور پھر کسی آباد بازار کی مختلف آوازیں فیڈ اِن ہوتی ہیں۔ اِن آوازوں میں محض کاروں کے ہارن، گھنٹیاں، قہقہے اور بال رُوم کی موسیقی ہے۔)

بوڑھا : (کھانستے ہُوئے، اپنے آپ سے)

اُف یہ جاڑے کی خنک شام،
یہ ٹھنڈے جھونکے، —— جسم مفلوج ہُوا جاتا ہے
جیسے شریانوں میں تھم جائے لہو کی گردش
یہ بڑھاپا، یہ خزاں کا موسم
دونوں بے رنگ، حرارت سے تہی —— دونوں محرومِ تپش
جل چکا کب سے بڑھاپے کے جہنم میں گنہگار بدن کا ایندھن
اب تو اک پیکرِ خاکستر ہوں
زندگی راکھ کا ڈھیر
اب کوئی آگ اسے حدتِ جاں تاب نہیں دے سکتی
اُف یہ جاڑے کی خنک شام
یہ ٹھنڈے جھونکے

(لہجہ بدل کر) خالدہ !
بند کر دے یہ دریچے کے کواڑ
کتنی بے رحم ہے بیٹی تو بھی
میں چراغِ سحری، اور تجھے
طلبِ بادِ شمال
کیا اِسی دن کے لیے تجھ کو جواں ہونا تھا ؟

(اپنے آپ سے)

کاش اِس دخترِ بے فیض کے بدلے قدرت
بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات
بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات !

آمنہ : (قدرے دُور سے —— سن رسیدہ آواز)

کیا ہُوا ؟ کیوں بلا وجہ پریشان ہُوئے جاتے ہو ؟
اِک ذرا صبر کرو
آگ روشن کیے دیتی ہوں ابھی
تم کو زیبا نہیں ہر وقت جواں بیٹی کو
ایسے مطعون کرو
خالدہ بیٹوں سے بڑھ کر مری پیاری بیٹی
کس قدر نیک ہے، معصوم ہے، سنجیدہ ہے
ہم کہ اب ٹوٹتی گرتی ہُوئی دیواریں ہیں
اس کا معصوم سہارا بھی بہت ہے ہم کو
جو شب و روزِ جوانی کے تقاضوں کو نچھاور کرکے
ہم پہ قربان ہُوئی جاتی ہے
بوڑھے ماں باپ کی خدمت پہ کمر بستہ ہے

بوڑھا : آمنہ، کتنی کم فہم ہے تُو
تیری کوتاہ نظر

صرف امروز کی مجرم ہے مگر
تجھ کو فردا کی خبر کچھ بھی نہیں
آہ میں کیسے کہوں ، کیسے تجھے سمجھاؤں
خالدہ کس لیے ہر شام کئی پہروں تک
اپنے ماحول سے بیگانہ کسی دھیان میں گم
اس دریچے میں کھڑی رہتی ہے

آمنہ : یوں اگر ہے بھی تو پھر
کونسا ظلم ہُوا !
دن بھر اسکول پڑھانا بھی تو کچھ سہل نہیں
نوکری ایک اذیت ہے ، کوئی کھیل نہیں
اور وہ بیچاری تھکن کی ماری
شام کے وقت کبھی اپنے دریچے میں کھڑی
خود کو بہلائے اگر شہر کے نظّاروں سے
تو یہ معصوم سی تفریح بھی ہے جُرمِ عظیم
کتنے بے درد ہیں احسان فراموش ہیں ہم
کتنے ظالم ہیں ستم کوش ہیں ہم

(دھیمے اور اُداس لہجے میں)

خالدہ ! کتنی بدبخت ہے تُو
کتنی بے رنگ ہے معصوم جوانی تیری
تیری قسمت میں نہیں ہے شاید
کہ تری مانگ میں افشاں کے ستارے چمکیں
کہ ترے ہاتھوں میں گلزار حنا کے مہکیں
تیری تقدیر میں محنت کے بیاباں ہیں فقط
اور ماں باپ کی بوڑھی لاشیں
، بدبخت ہے تُو !

(سسکیاں لینے لگتی ہے ——— دُور سے خالدہ کے گنگنانے کی آواز آتی ہے)

بوڑھا : سُن !
سُن یہ آواز کہ ہے اس میں نہاں
تیری بیٹی کا سسکتا فردا
غم فشاں ، نوحہ کناں !
خالدہ میری نظر میں بھی ہے معصوم مگر
مجھ کو اس ہنستے ہُوئے شہر سے خوف آتا ہے
اس کے ہنگاموں سے رعنائیوں سے
جگمگاتی ہُوئی راہوں سے ، چمکتے ہُوئے بازاروں سے
قہقہوں اور بھٹکتی ہُوئی خوشبوؤں سے
اس کے نغموں سے حسیں رنگوں سے
اس کی دیواروں سے نظّاروں سے خوف آتا ہے
تو نہیں جانتی
اس شہر کی یہ روشنیاں
چھین لے جائیں گی اک روز ترے اور مرے گھر کا یہ ننھا سا یہ معصوم چراغ
آنکھ کا نور ، بڑھاپے کا سکوں ۔ خالدہ

(خالدہ کی آواز اُبھرتی ہے)

خالدہ : اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر
سورج ڈوب چلا تو کتنے دیپ جلے

شام کے سائے روشنیوں میں ڈوب چلے
یہ خوشبو کے بوجھل جھونکے
یہ کرنوں کی نہر　　　　اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

یہ لوگوں کے ہنستے ارمانوں کے روپ
رات ہوئی تو دمک اٹھی چہروں کی دھوپ
میرے دل میں کیوں ہے اتر،
انجانے درد کی لہر　　　　اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

تیرے ہنگاموں کی دنیا نور ہی نور
میرے دھیان میں تاریکی ہے ، میں مجبور
میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں
تو امرت یا زہر　　　　اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

(نغمہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے اور موسیقی سے منظر بدلنے کا تاثر پیدا ہوتا ہے ۔ ہال میں ایک مصوّر کی تصویروں کی نمائش ہے ، ہجوم کی ملی جلی آوازوں کے اثرات)

دوسرا منظر

آواز ع۱ : خوب تصویریں ہیں

ع۲ : کتنی ترتیب سے آویزاں ہیں

ع۱ : ہاں کسی فن کی نمائش بھی تو اک فن ہے

ع۲ : ذرا دیکھو تو

ع۱ : اس طرف دیکھو یہ تصویر

ع۲ : "غزالِ صحرا" فن کی معراج ہے یہ ۔ جس طرح قاف کی آوارہ پری ہو کوئی

ع۱ : اے مصوّر ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں

ع۲ : خوب تصویر بنائی مرے بہلانے کو

ع۱ : "صبحِ نو"

ع۲ : قابلِ داد ہے ان رنگوں کی آمیزش بھی

ع۱ : کتنے موزوں ہیں یہ باریک خطوط

ع۲ : نور و ظلمت کی کشاکش کا عجب منظر ہے

ع۱ : جس طرح شب کی قبا چاک ہوئی جاتی ہو

ع۲ : آبشار کلۂ کوہ سے گرتا ہوا دریا ، توبہ !

ع۱ : کتنی بپھری ہوئی ہر موج نظر آتی ہے
جیسے ہر سنگِ گراں ٹوٹ کے بہہ جائے گا
جو بھی تصویر ہے شہکار ہے ، فن پارہ ہے

سالمی : ارے زاہدہ تم بھی موجود ہو

زاہدہ : کون ؟ سالمی . . . . یونہی بس چلی آئی تھی
اس مصوّر کے فن سے عقیدت ہے مجھ کو

سالمی : بڑی خوبصورت تصاویر ہیں

زاہدہ : واقعی فن کے شہکار ہیں

سالمی : جس کو دیکھو وہی نقش پائے مصوّر میں گم ، بُت بنا ہے
ارے ! خالدہ اور یہاں

زاہدہ : کیوں اسے دیکھ کر تم کو حیرت ہوئی

سالمی : بچاری کی تقدیر میں صرف اسکول ہے اور گھر ہے

زاہدہ : مگر آج تو وہ نمائش میں آئی ہوئی ہے
خدا جانے کیسے بیچاری کا مفلوج باپ اور معذور ماں
دونوں اِس کے سہارے پہ زندہ ہیں .....
اور خالدہ خود بھی اِس عمر میں فلسفی بن چکی ہے
کہ جیسے کسی اور دنیا کی باسی یہاں آ گئی ہو
اِسے آرٹ سے ہے لگاؤ
مگر زندگی سے کسی اور رخ سے محبت نہیں ہے

زاہدہ : بیچاری اکیلی کھڑی ہے
چلو اس سے باتیں کریں

سالمی : زاہدہ تم نہیں جانتیں
اس کی دنیا انھیں سرد تنہائیوں ہی سے آباد ہے
دیکھ لو ایک تصویر کے سامنے کیسے مبہوت ہے

زاہدہ : اور ہاں اس کے ہونٹوں کی جنبش کہ جیسے کوئی خود سے محوِ سخن ہو

سالمی : چلو اب چلیں لوگ جانے لگے ہیں

(ہجوم کی آوازیں فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہیں)

خالدہ : (اپنے آپ سے) یہ تصویر کس شہر کی ہے ؟ سماں
کتنا مانوس ہے
جیسے میری نگاہیں اسے روز و شب دیکھتی ہوں
یہ اُونچی عمارات یہ جگمگاتے در و بام ۔ روشن دریچے
یہ شفاف سڑکیں، بھڑکتے لبادوں میں خوش باش انساں
حسیں رقص گاہوں میں یہ نغمے ، قہقہے
زندگی ، روشنی ۔ زندگی ، روشنی
اور یہ ایک گوشے کے سائے میں ڈوبا مکاں
نیم وا اک دریچہ
یہ کیوں روشنی کے سمندر کی قربت میں بھی
اِک کرن سے بھی محروم ہے ۔ کیوں ؟
نہیں ، یہ چمکتا ہوا شہر ۔
اور یہ اندھیروں میں ڈوبا مکاں
جیسے میرا ہی شہر اور ۔ میرا مکاں ہو
مصوّر
مصوّر ! یہ کس کا مکاں ہے ؟

مصوّر : یہ کس کا مکاں ہے ؟ یہ کس کا مکاں ہے ،
مجھے خود نہیں علم یہ روشنی سے چمکتا ہوا جگمگاتا ہوا شہر کس کا ہے
اور یہ اندھیرے میں ڈوبا مکاں خود مرے واسطے اجنبی ہے

خالدہ : (چونک کر) کون ؟

مصوّر : خاتون ! میں ہی وہ مجرم مصوّر ہوں جس کی پریشان تصویر نے آپ
کے ذہن کو اتنا اُلجھا دیا ہے ؛
سبھی لوگ میری بنائی ہوئی ان تصاویر کو دیکھ کر جا چکے ہیں
مگر اُن کی آنکھیں
فقط شوخ رنگوں ، چمکتی لکیروں ، فسوں کار قوسوں میں کھوتی رہی ہیں
سبھی نے فقط جگمگاتے ہوئے شہر کا نور دیکھا
مگر بھول کر بھی کوئی اس اندھیرے مکاں تک نہ پہنچا
یہ سایوں کی دنیا ، اندھیروں کا مسکن
مصوّر کا اک نقش نوحہ کناں ہے
یہ ناکام کاوش !
مری نا تمام آرزو اس ہجومِ فراواں میں بھی
اک نگاہِ کرم کو ترستی رہی ہے
یہ توہین فنکار کی موت ہے
ہاں یہ توہین ۔ فنکار کی موت ہے

خالدہ : مصوّر مگر اس کی ..... قیمت ؟

مصوّر: فقط قدردانی

خالدہ: مرا مدعا ہے ..... اگر میں اسے لینا چاہوں

مصوّر: نہیں یہ ابھی نامکمل ہے

خالدہ: وہ کس طرح ؟

مصوّر: اس اندھیرے مکاں کا دریچہ
ابھی منتظر ہے کسی ایسے پیکر کا
جس کے رگ و پے میں یہ جگمگاتا ہوا شہر طوفاں اُٹھالے
مگر اس کے قدموں میں ساحل کی زنجیرِ ظلمت پڑی ہو
یہی نور و ظلمت کی پیہم کشاکش
مرے شاہ پارے کو تکمیل کا رنگ دے گی
مجھے اس خیالی ہیولے کی، اس پیکرِ خواب کی جستجو ہے
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی

(اپنے آپ میں کھوئے ہوئے لہجے میں)

یہ خاتون تصویر میں کس قدر کھو گئی ہے
یہ بکھری ہوئی زلف ۔ جیسے زمانے کا دُکھ اس پہ سایہ فگن ہو
یہ نمگیں آنکھیں ۔ کہ جیسے کسی خواب گوں جھیل میں
، وہ کنول شام ہستی کے کہرے میں لپٹے ہوئے ہوں
یہ گلنار لب جیسے باغِ جوانی کی کلیاں بہاروں کے انجام سے باخبر ہوں
یہ معصوم چہرہ کہ جیسے کسی جگمگاتے ہوئے شہر پر دھند سی چھا گئی ہو
مسلسل اُداسی میں ڈوبی ہوئی نوجوانی
خموشی میں بھی نوحہ گر ہے
یہ پیکر وہی ہے جسے میں نے
مغموم صبحوں میں، خاموش شاموں میں، ویران راتوں میں ڈھونڈا
مجھے مل گیا میرے تاریک و تنہا مکاں کا مکیں
(قریب آتے ہوئے) اجنبی نیک خاتون! میں آپ کی قدردانی کا مشکور ہوں
میرے فن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ میں آپ کی نذر کر دوں یہ تصویر
لیکن اگر آپ کچھ روز اس نامکمل ہیولے کی تکمیل تک ایک زحمت اُٹھائیں

خالدہ: وہ کیسے ؟

مصوّر: مری آرزو ہے کہ میں اس اندھیرے مکاں کے دریچے میں
اس روشنی کی کرن کھینچ لاؤں
جو اس جگمگاتے ہوئے شہر کی تابناکی سے تابندہ تر ہو
اگر آپ کچھ روز تک شام کو چند لمحے
مرے سامنے آ کے بیٹھیں
تو میں آپ کو اپنی تصویر کے اِس دریچے کی زینت بنا دوں
یہ شاہکار جس دن مکمل ہو ۔ بس آپ کا ہے

خالدہ: مصوّر ۔ مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے
گر میری موجودگی تیرے فن کے کسی کام آئے
تو میں ..... خواہ کچھ ہو ۔ یہاں روز آتی رہوں گی
ارے شام ڈھلنے کو ہے ..... لوگ سب جا چکے
مجھ کو لازم ہے اب میں بھی جاؤں

مصوّر: تو کل شام؟

خالدہ: ہاں میں ضرور آؤں گی

تیسرا منظر

(وہی جو پہلے منظر میں ہے)

بوڑھا: آمنہ!
ہو چکی شام مگر خالدہ اسکول سے اب تک نہیں واپس آئی
وسوسے مجھ کو پریشان کیے دیتے ہیں

آمنہ : آج کچھ دیر سے آنے کے لیے اس نے کہا تھا مجھ سے
اس کے اسکول کے پاس
اِک نمائش تھی — وہیں آج اسے جانا تھا
ابھی آتی ہوگی

بوڑھا : ہوں، تو اب
اُس کو بھی اس شہر کی رنگینیاں بہکانے لگیں
آخر اس پر بھی یہ پرچھائیاں اب چھانے لگیں
آہ اس شہر کی یہ روشنیاں !
کتنے معصوم چراغوں کو بجھا دیتی ہیں
کتنے تاریک مکانوں کو لٹا دیتی ہیں
آہ اِس شہر کی یہ روشنیاں !

آمنہ : جانے کیوں واہمے بدظن کیے دیتے ہیں تمھیں
خود سے، ماحول سے، بیٹی سے، سبھی دنیا سے !
واہمے کتنے گناہوں کو جنم دیتے ہیں
آدمی اپنے تراشے ہوئے بُت پوجتا ہے
ہم کہ اب عمر کی اس منزلِ تاریک میں ہیں
جس میں اک شمع کی موہوم سی ضو
ایک ہلکی سی کرن
خیرہ کر دیتی ہے آنکھوں کو — وہاں
تابِ نظارگیِ مشعلِ خورشید کسے
اپنی محرومی کا احساس ہے، اِس تنگ نگاہی کا سبب
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بوڑھا : ٹھیک کہتی ہو مگر
یہ مرے واہمے وہ تلخ حقائق ہیں جنھیں
میری بے نور نگاہیں ہی فقط دیکھتی ہیں
یہ نظر سوز نظارے یہ بھڑکتے منظر
یہ چکا چوند، یہ جلووں کا ہجوم
رنگ و آہنگ کا طوفان — یہ سیلِ انوار
اک ملمع ہے، نمائش ہے، دکھاوا ہے جسے
اک فسوں کار نے ہر سمت سجا رکھا ہے
ہائے اس سادہ و معصوم نظر کی قسمت
جو فقط ظاہری جلووں سے ہو مسحور مگر
موت کے دام سے بیگانہ رہے
اپنے انجام سے بیگانہ رہے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے)

آمنہ : خالدہ آگئی - بہتر ہے کہ خاموش رہیں

بوڑھا : میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا
میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا

چوتھا منظر

مصوّر کا کمرہ، چاروں طرف نامکمل تصویریں بکھری پڑی ہیں، جن پر گرد کی تہہ جم چکی ہے۔ مصوّر روشنیوں کے شہر کی تصویر ایزل پر رکھے اس کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اب اِک تصویر میں تاریک مکان کی جگہ روشن مکان جنم لے رہا ہے

مصوّر : تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
میرا دل میری تمنّا، مری جاں ہو جیسے
چشمِ نرگس کو میں کچھ اور بھی حیراں کر دوں
زلفِ آوارہ کو کچھ اور پریشاں کر دوں
حُسن کو پیرہنِ رنگ میں پنہاں کر دوں

جھیل میں پرتوِ مہتاب رواں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
جلوہ افروز ہو پردوں میں بھی افسونِ شباب
جس طرح شیشۂ مے سے نہ چھپے عکسِ شراب
آپ سے آپ کھلے جاتے ہیں ہونٹوں کے گلاب
آمدِ صبحِ بہاراں کا سماں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
کس قدر سادہ و رنگیں ہے جوانی تیری
میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری
ہر مصوّر تری جانب نگراں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ۔ کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور مصوّر خاموش ہو جاتا ہے)

مصوّر: کون؟ تم خالدہ، آؤ بیٹھو
خالدہ: مصوّر، بڑے خوش نظر آ رہے ہو
کہ جیسے جہاں بھر کی دولت تمھیں مل گئی ہو
مصوّر: بہت خوش ہوں میں، واقعی۔ جس طرح ایک دریوزہ گر کو
کوئی بخش دے ہفت اقلیم کی بادشاہت
خالدہ: ذرا ہم بھی جانیں کہ وہ کون حاتم ہے اور کونسی بادشاہت
ہے جس کے سبب تم وفورِ مسرت سے نغمہ بلب تھے
مصوّر: سخاوت اگر ہو تو ایسی
کہ دستِ کرم اپنی بخشش سے خود بے خبر ہو
مرے سامنے ہیں وہ بخشندہ و بادشاہت
خالدہ: (مسرت سے) مصوّر!
مصوّر: مری نا تمام آرزو آج پوری ہوئی ہے
یہ تصویر میری تمنا کی معراج
دیکھو۔ اندھیرے مکاں کے دریچے میں
یہ روشنی کی کرن۔ کس قدر ضوفشاں ہے
خالدہ: تو کیا یہ اندھیروں میں ڈوبا مرا ہی مکاں تھا
جہاں آج تابانیاں موجزن ہیں؟
مصوّر: نہیں تم تو خود روشنی ہو
ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں
یہ ظلمت میں ڈوبا مکاں
ایک فنکار کا غمکدہ، اِک مصوّر کا تصویر خانہ تھا جس پر
زمانے کی بے اِعتنائی کے سائے پر افشاں رہے ہیں
کسی نے تمھارے سوا یہ نہ دیکھا
کہ اس سیلِ رنگ و طرب میں بھی آخر کوئی نوحہ گر ہے
تمھارا کرم تھا کہ تم حسبِ وعدہ
مرے فن کی تکمیل کو میرے ظلمت کدے میں کئی روز تک
روشنی لے کے آتی رہی ہو
خالدہ: تو کیا اے مصوّر، تمھارا مکاں بھی اندھیروں میں گم تھا؟
تو کیا ہر مکاں تیرہ و تار سایوں میں ڈوبا ہوا ہے؟
یہ سب روشنی پھر کہاں کھو گئی ہے؟
کہاں ہے وہ خورشید، وہ منبعِ نور؟
وہ روشنی کا سمندر

کہ جس کے لیے تیرہ و تار دنیائیں شام و سحر منتظر ہیں
مصوّر تمہیں روشنی کی ضرورت نہیں
میرا تاریک گھر اک کرن کو ترستا ہے
اور یہ کرن .... یہ کرن ؟

مصوّر: ہاں تمہاری ہے اور حسب وعدہ یہ تصویر حاضر ہے
اب اِس مکاں میں اندھیرا نہیں
یہ بھی اس جگمگاتے ہوئے شہر کا ایک حصّہ ہے
یہ تودۂ تیرگی سیلِ انوار میں گھُل گیا ۔ مِل گیا
روشنی تو ملی ۔ روشنی تو ملی

خالدہ: اچانک تمہاری نگاہوں میں کس سورج کے دائرے تیرنے لگ گئے ہیں
یکایک مسرت کی لہروں میں کن حسرتوں کے بھنور پڑ گئے
جس طرح تم پل بھر میں ہی چھن گئی ہفت اقلیم کی بادشاہت
کہو .... چپ ہو کیوں .... کچھ تو بولو، مصوّر

مصوّر: نہیں کچھ نہیں، سوچتا ہوں کہ جب چاند تارے بھی محتاج ہیں روشنی کے
تو پھر میں اندھیروں کا باسی
کہ جس کے مقدر میں تاریکیاں ہیں اندھیرے ہیں
کیوں آرزوئے ضیا میں ۔ اُجالوں سے شکوہ کناں ہوں
مجھے میری تاریکیاں چاہئیں، صرف تاریکیاں، صرف تاریکیاں
مجھے جگمگاتے ہوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا ہے
کہ میں اپنے فن کا گلا گھونٹ کر سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا
مصوّر کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے
اسے جگمگاتے ہوئے شہر سے کیا ؟
تو .... خاتون .... کل شام میں آپ کے شہر کو چھوڑ جاؤں گا
کل شام، اسی وقت

خالدہ: تو کیا واقعی تم مرے شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟
مصوّر نہ جاؤ .... نہ جاؤ مصوّر،

مصوّر: مجھے صرف فن سے محبت ہے
شہروں سے، لوگوں سے، صبحوں سے، شاموں سے نسبت نہیں ہے
مجھے آپ سے آپ کا عکس پیارا ہے
جو میں نے خونِ جگر سے سجایا ہے، روشن کیا ہے
اسی کے لیے میں یہاں چند دن رُک گیا تھا
اور اب جب مکمّل ہے یہ نقش ۔ میں جا رہا ہوں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

پانچواں منظر

(وہی جو پہلا منظر ہے)

بوڑھا: آمنہ ! ہو چکی شام مگر خالدہ گھر آئی نہیں
جانے کیا بات ہے ۔ کیوں آج پریشاں ہے طبیعت میری

آمنہ: ابھی آتی ہو گی

بوڑھا: ابھی آتی ہو گی
اب تو یہ روز کا معمول ہُوا
خالدہ شام سے پہلے کبھی گھر آتی نہیں
اور گھر آئے تو اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتی ہے
نہ اسے باپ کا غم ہے نہ اسے ماں کا خیال
طَور بے طَور ہُوئے جاتے ہیں

اس کے انداز ہی کچھ اور ہوئے جاتے ہیں

آمنہ : جانے یہ واہمے کب ختم تمھارے ہوں گے
تم کو معلوم تو ہے
خالدہ ان دنوں اسکول میں مصروف بہت رہتی ہے
صبح سے شام تلک
اِک اذیت میں گرفتار ہے نازک بچی

بوڑھا : چاہے تم کچھ بھی کہو (تلخ لہجے میں) کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی

(خالدہ کے قدموں کی چاپ)

آمنہ : خالدہ آگئی

بوڑھا : کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی

خالدہ : کیا ہُوا ؟

بوڑھا : خالدہ ! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی
سن لیا ؟ کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ : ہاں .... مگر

بوڑھا : بس نہیں جاؤ گی تم

آمنہ : لیکن اتنا سوچو
خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر ؟
تم بھی معذور ہو ... میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

بوڑھا : وائے محرومیٔ تقدیر کہ جس کے باعث
آج میں اپنی جواں بیٹی پہ
بار ہوں — بارِ گراں
پھر بھی میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا
خالدہ، باپ کی محتاجی و معذوری کے پردے میں مری
اتنی تذلیل کرے
اس سے پہلے کہ یہ افلاس مرا
مری غیرت مری ناموس کا نیلام کرے
میں بجھا دوں گا ہر اک شمعِ حیات
زندگی، موت سے بدتر ہے اگر غیرت و ناموس نہیں . .
کچھ بھی ہو
مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب
مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب

(شدت سے کھانستا ہے)

موسیقی

(شام کا منظر — گھڑیال سات بجاتا ہے — کسی آباد شہر کا بازار
ہارن، گھنٹیوں، قہقہوں اور بال روم کی موسیقی کے اثرات)

چھٹا منظر

(وہی پہلا منظر — کھڑکی سے روشنیوں کا شہر دکھائی دے رہا ہے —
موسیقی کی آواز لوگوں کے قہقہوں میں گھلتی جا رہی ہے — کمرہ خالی ہے
— خالدہ کھڑکی سے لگی کھڑی باہر دیکھ رہی ہے)

خالدہ : (اپنے آپ سے) آہ یہ شام کس درجہ اندوہگیں ہے
مگر آج بھی شہر کا ہے یہ عالم
کہ ہر سمت جیسے چراغاں ہُوا ہو
وہی روز کے زمزمے، قہقہے، قہقہے جیسے جشنِ طرب ہو
وہی جگمگاتے در و بام، روشن دریچے
وہی رقص گاہوں کے منظر
یہ نغموں کا سیلاب گیتوں کی کڑیں

بھڑکتے لبادوں میں خوش باش رہگیر، خوش بخت پیکر
وہی زندگی روشنی — روشنی زندگی
اور میرا مکاں — اے مصوّر، یہ تصویر میری نہیں ہے
نہیں .... میری دنیا میں اب تک اندھیرے بسے ہیں
یہاں ظلمتیں اب بھی نوحہ کناں ہیں مصوّر

مصوّر کی خیالی آواز : نہیں تم تو خود روشنی ہو
ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں
مجھے جگمگاتے ہوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا تھا
کہ میں اپنے فن کو سسکتا ہوا چھوڑ کر
سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا
مصوّر کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے
میں یہ جگمگاتا ہوا شہر کل چھوڑ جاؤں گا
کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

خالدہ : مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو
مگر .... ہاں — تمھیں اپنے فن سے غرض
اپنے بے جان رنگوں، ادھوری لکیروں سے
خاموش سایوں سے، ساکن ہیولوں سے اُلفت ہے
تم نقش گر ہو، تمھارے لیے زندگی میں
دھڑکتے دلوں، گنگناتے لبوں، جھلملاتے چراغوں لپکتی شعاعوں میں
کچھ بھی نہیں ہے !
فقط کاغذی بُت، خیالی صنم، سرد لاشیں
تمھاری نگاہوں کے مرکز — مگر بولتی زندگی سے گریزاں

بوڑھا : (خیالی آواز) خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی
خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

آمنہ : (خیالی آواز) خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر
تم بھی معذور ہو میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

خالدہ : نہیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے
میں کب تک یہ لاشیں اُٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں
مری زندگی سرد لاشوں کے بارِ گراں سے سسکنے لگی ہے
مصوّر! مجھے اب تمھاری ضرورت نہیں ہے
کہ تم بھی اسی جگمگاتے ہوئے شہر کی اک کرن تھے
تمھارا وجود ایک زرتاب ذرّہ تھا جو
اپنے مرکز سے پھر جا ملا
تم بھی اس شہر کے ایک جگنو تھے
جو ان اندھیروں میں اک پل کا مہمان تھا اور بس
اک کرن، ایک جگنو سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے
یہ لاشیں
کہ جن کے لیے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے
اب وہ بھی مجھ کو فقط باعثِ ننگ گردانتی ہیں
تو کیا وہ مقدس فریضہ مرا جرم تھا جس کی خاطر
میں اک لاش بن کر اندھیروں میں ڈوبی رہی ہوں
تو کیا یہ مری زندگی شپّرک کی طرح
تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی
مرے سامنے اک طرف یہ چمکتا ہوا شہر ہے

روشنی کا سمندر ہے
جو سرد لاشوں سے بیگانہ ہنستی ہوئی زندگی کا جہاں ہے
اور اک سمت ساحل کی زنجیرِ ظلمت مری آرزوؤں کی قاتل
اُدھر روشنی — زندگی
اور اِدھر — موت، اور موت کی تیرگی
اگر یہ اُجالے مری دسترس میں نہیں ہیں
تو پھر، موت کی مستقل تیرگی کو نہ کیوں اپنا مسکن بنا لوں؟
میں اِس نور و ظلمت کو اب توڑ دوں گی
فقط موت ہی میری اِس کشمکش کا مداوا ہے
میں توڑ دوں گی یہ زنجیرِ ظلمت، شعاعوں بھرے شہر (دریچے سے چھلانگ لگاتی ہے)

بوڑھا: خالدہ! خالدہ!

(غمگین موسیقی)

آہ اے شہر، چمکتے ہوئے ہنستے ہوئے شہر
کتنا بے رحم ہے سفاک ہے تو
تیرے بے خواب دریچوں کے اُجالے جلاد
تیرے شب تاب ستونوں کی ضیا، تیغِ ستم
تیرے نغموں کی کھنک، ساغرِ سم
تیری ضوبار عمارات ہیں، مقتل گاہیں
تیری رعنائیاں، آنکھوں کا فریب
یہ ترا حسن ملمع ہے، نمائش ہے فقط
ریگِ رواں، موجِ سراب!
تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
تُو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
اے چمکتے ہوئے شہر
اے چمکتے ہوئے شہر

○

راغب مراد آبادی

نکتہ داں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ
خُوش بیاں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ
آبروئے شاعرانِ نغز گو
بے گماں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ
میرؔ، غالبؔ، داغؔ اور اقبالؔ کے
ہم زباں ہیں ڈاکٹر احمد فرازؔ
راز یہ صنفِ غزل سے پوچھیے
حرزِ جاں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ
آسمانِ شاعری پر مثلِ ماہ
ضوفشاں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ
اس کا دورِ آمریت ہے گواہ
حق نشاں ہیں ڈاکٹر احمد فرازؔ
تاج ہے ڈی لٹ کا زیبِ فرق آج
شاداں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ
میزباں تو ہیں گورنر سندھ کے
مہماں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ
کیوں نہ کہہ دوں، دردِ دل راغبؔ بیا
جب یہاں ہیں، ڈاکٹر احمد فرازؔ

فراز صاحب کے کلام کے تراجم

شائیلاک

شائیلاک نے صدیوں پہلے
ایک طلائی مہر کے بدلے
میرے جسم سے گوشت کا ٹکڑا مانگا تھا
اور دنیا حیران ہوئی تھی
یہ لمحہ انساں کے سارے عزّ و شرف پر
گویا خطِ تنسیخ بنا
یہ قصہ تمثیل بنا ، تاریخ بنا

آج کے شائیلاک نے لیکن
مجھ کو میری انا کے بدلے
اشرفیوں اور درہم کے انبار دیئے
اس سودے میں
اس نے میرے ربطِ جاں کے
جتنے زندہ تار تھے ، سارے مار دیئے
جسم کی حرمت
روح کی غیرت خواب ہوئی
تیغِ انا بے آب ہوئی

میرے وجود پہ آرا چلتا جاتا ہے
میری زمین کا نام بدلتا جاتا ہے

انگریزی

Shylock

Centuries ago
Shylock
For a gold coin
Asked for a piece of flesh from my body.
And the world was stunned:
That moment
Cancelled man's dignity and honour.
That story became a fable of historical importance.

But today's Shylock
Gave me heaps of gold coins
For my self-respect.
In this transaction.
He broke all the strings of my life's lyre.
The body's sanctity.
The dignity of spirit
Disappeared:
The sword of the ego was blunted.
A saw cuts through my existence:
The name of my country is gradually changing.
And I keep quiet.

مت قتل کرو آوازوں کو

فرانسیسی

ڈاکٹر لئیق بابری

تم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اُتارے جاتے ہو

ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو

اِس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو

ہم پالنہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں
تم کس کا لہو پینے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں

اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا
جب تیغ پہ لَے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا

جب قتل ہوا سُر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا

جب شہر کھنڈر بن جائے گا
پھر کس پر سنگ اٹھاؤ گے
اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

Döda inte rösten

Ni slungar er tros spjut
In i varje hjärta.
Vi är kärlekens folk,
Varför riktas denna dolk mot oss?

Låt musiken höras här
Och låt även oss leva i vår stad.

Det är vi som planterar blommor,
Det är vi som låter oss vårda om doften.
Vems blod vill ni spilla?
Vi sprider ju bara kärlek.

Vad kommer ni att finna i denna stad
När ordet dödats,
När melodin sönderskurits med svärd
Och sången gått förlorad?

När musiken tystats
Och stämmorna blivit få?

När staden förvandlats till ruiner –
Vem skall ni stena då?
Var gång ni ser er själva i spegeln,
Skall ni förfäras av era egna bilder!

شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شعبدہ گر
تو کہ الفاظ سے اصنام گری کرتا ہے
کبھی اُس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہُو بھرتا ہے

بارہا دل نے یہ آواز سُنی اور چاہا
مان لوں مجھ سے جو وجدان مرا کہتا ہے
لیکن اُس عجز سے ہارا مرے فن کا جادو
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

शिकस्त

बारहा मुझ से कहा दिल ने ऐ शैब्दा गर
तू कि अलफ़ाज़ से असनाम गरी करता है
क़भी उस हुस्ने-दिल आरा की भी तस्वीर बना
जो तेरी सोच के खाकों में लहू भरता है

बारहा दिल ने यह आवाज़ सुनी और चाहा
मान लूँ मुझ से जो मेरा वज्दान कहता है
लेकिन इस इज्ज़ से हारा मेरे फ़न का जादू
चान्द को चान्द से बढ़ कर कोई क्या कहता है

پنجابی

جدوں اتیکاں دی رُت بدلی تے پندھ واشناوا کتھے ویکھنا ایں
وانگ پھُلاں دے پھٹاں نے مہکنا ایں پر ایہہ میلا کتھے ویکھنا ایں

تسی ویکھیا جے اتھے محو ہوندے سبھے لوک پھٹیوڑوے رقص اندر
جیہڑے پاسیوں تیراں دا وار ہو یا بھلا اوہ پاسا کتھے ویکھا ایں

جتّے پھٹ ہوئے ساڈے تن اتے اوہناں لگنا ایں ناویں قاتلاں دے
ساڈے تن تے دردیا ساڑیا اوئے تیرا وار بھلا کتھے ویکھنا ایں

سانجھ حرص دی ہووے یا پریت والی گل کے مراداں توں کھنجنے تے
پھُلاں پھلاں دے نال پچھان ہووے نیں تے رکھ بُٹا کتھے ویکھنا ایں

جنہے شہر تے آن چڑھائی کیتی جھاتی مار کے اوس نوں ویکھ تے سہی
لگی اگ جے شہر نوں بجھا اوئے تیرا سوجھ سبھا کتھے ویکھنا ایں

جنہوں ویکھیے اوہا فرازؔ ایتھے پھرے لکدا آپنی پھوک اندر
دکھ جھاکدا تیریاں اکھیاں چوں وچ شہر بھلا کتھے ویکھنا ایں

ترجمہ : ماجد صدیقی

○

یوگوسلاوی

МЕСЕЦ И ЈА

Месецу рекох: мој сапатниче ноћни,
друже
усамљени,

лепота ти је жудња,
а судбина тамним плаштом
обвијена
ко уметност моја,
па кружиш над Земљом
у злој својој коби
вечно као плен
неба озлојеђеног.

Сапетих ногу, одани поданички,
погледа самотног
ћердамо свој живот усамљеним путем
и пустиње овде
обилазимо.

Зашто те присутност моја
онеспокојава
кад никад од мене
туробнији
ниси?

Месец мени каже:
песниче безумни и мој друже блиски,
станишта самоће познајеш и ране
моје душе
знаш
док свуд око мене море је тишине,
па реч у њој
твоја
мелемно одзвања.

На грудима мојим окови су ноћас,
мрљају крв моју,
а нема на месецу ни сребра, ни злата:
све је овде жеља што тамо постоји,
овде само човек
краде моје благо
једино:

свет мој — усамљеност моју.

حرفِ تحسین

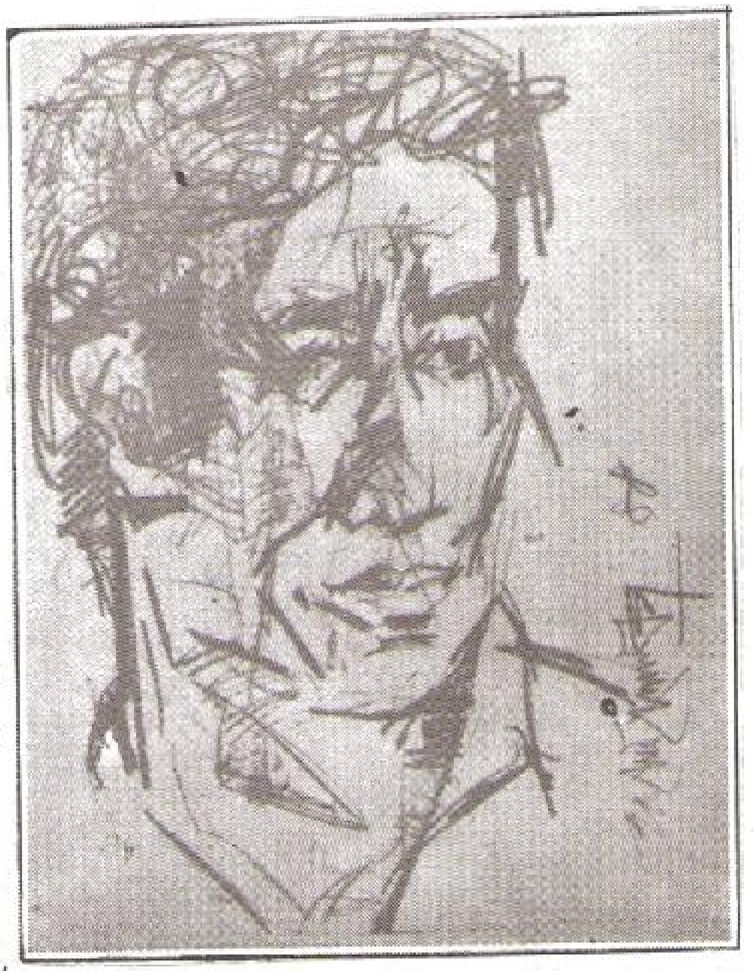

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

فراز صاحب کی انقلابی شاعری انتہائی نامساعد حالات میں بلند رہی اور ساتھ ہی اعلیٰ ترین ادبی روایات پر بھی پوری اتری۔

محترمہ بے نظیر بھٹو (وزیرِ اعظم پاکستان)

"احمد فراز عوام کا شاعر ہے وہ استعاراتی اور پیغمبرانہ لہجے میں بولتا ہے اس کی بصارت دلوں میں اتر جاتی ہے وہ مقامی اور قومی تعصبات سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے وہ سچے معنوں میں ایک بین الاقوامی شاعر ہے ایک خالص انسان دوست ہے خالص انسان دوست اس لئے کہ اس کی شاعری محبت کی شاعری ہے حتیٰ کہ اس وقت بھی جب وہ معاشرتی ناہمواریوں اور منفی انسانی قدروں پر طعنہ زن یا ماتم کناں ہوتا ہے جیسے وہ اپنی نظم پیغمبر ﷺ کے حضور تحریر فرماتے ہوئے (آپ کا پیغام محبت تھا اور میرا دل تباہ حال لوگوں پر آنسو بہاتا ہے) وہ عوام کے خلاف تشدد کو خواہ وہ کسی صورت میں ہو برداشت نہیں کر سکتا اس کی آواز سنیں وہ اپنی بات کرتا ہے۔ تمھاری بات کرتا ہے اور سب انسانوں کی بات کرتا ہے وہ وجدان کا ایک بولتا ہوا شعلہ ہے۔

Mary Mcnally (ممتاز امریکی شاعرو نقاد)

سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں
سو اس کے شہر میں کچھ دن ٹھہر کے دیکھتے ہیں

جیسی غزل احمد فراز کہہ گئے ہیں گزشتہ پچاس برس سے آج تک اتنی خوبصورت مرصع اور بھرپور غزل کسی نے نہیں کہی میں سمجھتا ہوں کہ احمد فراز کی یہ ایک غزل پوری اردو شاعری کے مستقبل کو روشن تر اور تابناک رکھ سکتی ہے۔

(علی سردار جعفری)

فراز کی شاعری غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین سنگم ہے۔ ان کی غزلیں اس تمام کرب والم کی غمازی کرتی ہیں جس سے ایک حساس اور رومانٹک شاعر کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کی نظمیں غمِ دوراں کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں اور ان کی کہی ہوئی بات "جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے۔"

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

فراز اپنے وطن کے مظلوموں کے ساتھی ہیں، انہیں کی طرح تڑپتے ہیں مگر روتے نہیں بلکہ ان زنجیروں کو توڑتے، ٹکڑے بکھیرتے نظر آتے ہیں جو انکے معاشرے کے جسم کو جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کا شعر نہ صرف یہ کہ اعلیٰ ادبی معیار کا ہے بلکہ ایک شعلہ ہے جو دل سے زبان تک لپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ آئے فیض اور ن۔ م راشد کے بعد مگر اساتذہ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک اچھا شاعر اپنے بعد آنے والوں کو راہ دکھاتا اور متاثر کرتا ہے۔ فراز کا شمار اب ان میں ہے۔ یہ ان کی پریشاں نفسی اور آتش زیرپائی ہے، جو انہیں ایک جگہ ٹھیرنے نہیں دیتی۔ دنیا کی کسی ادبی محفل میں جائیے آپ کو حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ احمد فراز سے ملاقات ہوگئی۔ گویہ عالم ہیں اور آپ عالمی مسافر، بقول انہیں کے ایک لفظ کی تبدیلی کے ساتھ۔

میں نے جس جس کو بھی چاہا ترے ہجراں میں وہ لوگ
آتے جاتے ہوئے موسم تھے زمانہ میں تھا!!

مجروح سلطان پوری

اس قدر مسلسل تھیں شدتیں جدائی کی
آج میں نے پہلی بار اس سے بے وفائی کی

فراز صاحب کی یہ راست گوئی ان کے کلام کی اہم شناخت بن گئی ہے۔ ان کی شاعری میں غم جاناں اور غم دوراں کا بڑا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس خوبصورت اور دلکش امتزاج میں فراز صاحب کی شاعرانہ چابکدستی کا پورا پورا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ساتھ ساتھ انہیں زبان وبیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ شاعری کی مختلف صنفوں میں وہ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ انہیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

خمار بارہ بنکوی

درد آشوب کا اب جو مجموعہ میرے ہاتھ میں ہے اس پر سن اشاعت درج نہیں مگر جو مجھے ملا تھا وہ یقیناً اس کا پہلا ایڈیشن تھا اس پر ابھی آدم جی ایوارڈ نہیں ملا تھا مگر پھر بھی اس کے کچھ اشعار نے مجھے اس قدر چونکایا اور متاثر کیا تھا کہ آدم جی انعام اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو اسے پہلے ہی دن اس مجموعے کو بخش دیتا اور سمجھتا کہ شاعر نے یہ انعام قبول کر کے انعام دہندگان پر احسان کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اب اس مجموعے پر یہ انعام دیا جا چکا ہے۔

ہرچرن چاولہ۔

احمد فراز کی آگہی اور ذہانت اپنے عہد کے نت نئے تقاضوں سے پوری طرح باخبر رہی ہے۔ انہوں نے ظلم و جبر اور استحصال کی سفاک طاقتوں کے مقابلے میں اپنے وطن کے اور ساری دنیا کے دبے کچلے انسانوں کی طرف داری کا عہد کیا ہے اور اس ستم کیش کوچہ میں مجاہدانہ بانکپن سے آگے بڑھتے ہوئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ قید تنہائی کے اذیت ناک دن بھی گزارے اور فیض کی طرح جبری ہجرت اور آوارگی کے ایام بھی بسر کیئے۔

ڈاکٹر قمر رئیس۔

فراز ایک ایسا لکھاری ہے جس نے ایک مظلوم و مجبور معاشرے کی ہر برائی دیکھی اور برداشت کی ہے لیکن اس کی روح پھر بھی سلامت رہی ہے وہ بغیر کسی شک اور ہچکچاہٹ کے بار بار دہراتا ہے۔ "لکھنے والے کی حیثیت سے یہ میرا مقدس فریضہ ہے کہ لوگوں کے مسائل کے بارے میں لکھوں۔ لیکن ایک منصفانہ اور غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کا انتظار طویل ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے جنت صرف شاعر کے تصور میں ہے۔"

سرندر کور۔

ہمارا ملک گزشتہ تین دہائیوں میں جس فکری سیاسی معاشی اور معاشرتی بدحالی کا شکار رہا ہے احمد فراز کی شاعری اس کی پوری طرح آئینہ دار ہے ان کی متعدد نظمیں ان حالات کا بھرپور احاطہ کیے ہوئے ہیں مگر انکا کلام ان حالات پر بے معنی تنقید یا بے جا کیچڑ نہیں اچھالتا ہے صرف ان کا تجزیہ کرتا ہے شعور کی بیداری نظریات کی صحت مندی کے لیے لکھنا وہ اپنا ادبی فریضہ سمجھتے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ملک سے دور یورپ اور شمالی امریکہ میں بالعموم اور کینڈا میں بالخصوص اپنی حق گوئی اور انسان دوستی کے لیے مقبول ہیں اور اس مقبولیت کا احساس فراز کو بھی اتنی ہی شدت سے ہے کہ کبھی وہ خود یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کہیں وہ کینیڈین تو نہیں ہیں۔

ضیا علیگ۔

احمد فراز اردو کے ان جوان فکر شاعروں میں سے ہے جنھوں نے غنائیہ شاعری کی گرتی ہوئی دیوار کو قدیم روایات اور جدید تقاضوں کے دل کش رنگ اور آہنگ سے قابل قدر سہارا دیا ہے۔ احمد فراز اگرچہ نوجوان ہے اور جدید شعراء کے گروہ ہی سے وابستہ ہے لیکن اسکو ان نئے شاعروں کی صف میں شمار کرنا درست نہیں ہے جن کی شعری تخلیقات میں خیال اور اظہار کی ایسی اشکال پائی جاتی ہیں جن کے بغیر ان کی شاعری ان کے نزدیک بے معنی اور بیکار ہو جاتی ہے۔ فراز کا شعری شعور بیسویں صدی کے درمیانی دور کی پیداوار ہے۔ اور یہ ایسا دور ہے جس میں عالمی اور مقامی سطح پر ہر قسم کی قدروں میں ان گنت تبدیلیاں ہوئی ہیں یہ تبدیلیاں اتنی شدت اور سرعت کے ساتھ رونما ہوئی ہیں کہ اس عہد میں زندگی بسر کرنے والوں کے لیے پرانی اقدار کا ساتھ دیتے ہوئے نئے سلسلوں سے وابستہ رہنا ہی اکثر مشکل ہو گیا ہے فراز نے اس کٹھن منزل کو بڑی جرات اور بے باکی سے سر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ کہاں تک کامیاب ہوا ہے یہ اس کے شعری مجموعے "درد آشوب" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔

قیوم نظر۔

احمد فراز میری زندگی کا وہ حصہ ہے جسے نہ تو میں کاٹ کر پھینک سکتا ہوں اور نہ ہی اس کی اہمیت کو کم کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے آج بھی ویسا ہی عزیز ہے جیسا کہ اس وقت تھا جب وہ میں اور محسن احسان ایک ہی تکون کے تین زاویے بنے ہوئے تھے۔

شہزاد احمد۔

آج فراز بفضل خدا سرحد اور برصغیر کا ہی نہیں پوری دنیا میں اردو کا مقبول ترین زندہ شاعر ہے۔ اور مجھے یہ سوچ سوچ کر دلی سرور ملتا ہے کہ جسے آج دوست دشمن سب مجبوراً مانتے ہیں میں نے آج سے 44-45 سال پہلے اسے ایک بلند مقام پر دیکھا تھا یہ وجدان کا کمال تھا۔

یوسف رجا چشتی۔

جو لوگ اس سے محبت کرتے ہیں ٹوٹ کر کرتے ہیں اور جو مخالفت کرتے ہیں تجاوز کر جاتے ہیں لیکن اسکی شخصیت اتنی پرکشش ہے کہ آمنا سامنا ہو جائے تو اسیر و شنام پابند سلام نظر آتے ہیں میں جو کٹر مذہبی آدمی نہیں ہوں لیکن خدا کا منکر بھی

نہیں ہوں لوگ مجھے دائیں کیمپ کا آدمی سمجھتے ہیں تو مجھے اس پر اعتراض بھی نہیں ہوتا لیکن فراز جو قطعی بائیں کیمپ کا آدمی ہے مجھے کبھی اجنبی نہیں لگا کبھی غیر نہیں لگا اس میں اپنائیت ہے یقین ہے اس میں شدید قربت کا احساس ملتا ہے اور جو چھٹی حس ہوتی ہے اور آدمی کی پہچان کراتی ہے۔

رحیم گل۔

فراز کو شاعری اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے، لیکن شاعرانہ قدو قامت اس کا اپنا ہے، اور یہ قدو قامت پانے کے لیے اس نے بڑے جتن کیے ہیں پہاڑ سی کالی راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں، اپنوں بیگانوں میں نکو بنا ہے، شاعری کی دیوی کے عشق میں مجنوں کی طرح خاک بسر مارا مارا پھرتا رہا ہے، تب کہیں جا کر اس کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

فارغ بخاری۔

کچھ ادب دوستوں کا خیال ہے کہ فراز کی اوائل کی شاعری صرف آپکی ان تک محدود ہے

لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے جوانی کی عمر شدت جذبات سے لبریز ہوتی ہے۔ اس عمر کی کچھ اپنی ضرورتیں اور تقاضے ہوتے ہیں جنہیں اس عہد میں پورا نہ کرنا۔ عطیات الہیہ سے انحراف کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اس عہد میں کوئی بھی ہو ان پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں یہ اسکا بنیادی حق ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناتے فراز نے بھی یہی کیا۔ لیکن "رہین ستم ہائے روزگار" کا مقید ہونے کے باوجود فراز اس بات سے کبھی غافل نہیں ہے۔ کہ اسے ایک نہ ایک دن ذات سے کائنات کی طرف سفر کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پہلے مجموعہ تنہا تنہا میں وہ اپنے اس سفر کا واشگاف لفظوں میں اعلان کرتا ہے۔ "تنہا تنہا" کی پہلی نظم۔ شاعر ہے---

فضل حسین صمیم۔

فراز کے ہاں فکر تخیل اور جذبے میں کوئی کشمکش نہیں الفاظ و معانی اور اظہار میں کوئی کھینچا تانی نہیں ان میں تعاون بلکہ یکجائی ہے وہ رادیتی تصورات کو منظوم کرنے کا قائل نہیں اس کے پاس ذاتی تجربات کی اتنی فراوانی ہے کہ اسے روایتی تصورات کی دریوزہ گری کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی وہ تو بحر اور ردیف قافیے میں بھی خانہ سازی کے عمل کا قائل ہے ان کے انتخاب میں وہ انفرادیت کے ساتھ ساتھ موضوع سے موزونیت کا بہت خیال رکھتا ہے۔

مسعود قریشی،

فراز کی شاعری زندگی کے بارے میں ایک وسیع تر اخلاقی اور سیاسی نقطہ نظر کی شاعری ہے ہرچند کہ ترقی یافتہ معاشرے شاعری کے منصب کے بارے میں زوال آمادہ آرا فراہم کرتے رہے ہیں لیکن زندگی بے رحم ہے فراز کی شاعری بھی اپنی تمام تر خوابناکی کے باوجود بے رحم ہونے پر تلی ہوئی ہے، جس معاشرے سے ہم تعلق رکھتے ہیں وہاں شاعری کے بارے میں Eliot اور Pound جیسے اشرافیہ پرست ناقدین کی آراء بے وقت کی راگنی معلوم ہوتے ہیں فراز جس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں شعراء اور شاعری کی ذمہ داریاں بنیادی نوعیت کی ہیں۔ شاعری کے ذمہ تعمیر اور تخلیق کے ساتھ ساتھ انسانی تہذیب کے صحت مند عناصر کی یکجائی بھی ہے، فراز کی شاعری نے بے شناختی کے گھپ اندھیرے میں وطن کے حسین در و بام کی تلاش اور ان کے ساتھ جس والہانہ وابستگی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے وہ ایک ایسے مصور کے حوصلۂ تنگ و تاز سے مماثل ہے جو ہماری رگ و پے میں وطن کی محبت راسخ کیے جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی۔

اسلام کے تاریخی کردار کے اس شعور اور محمد (صلعم) اور (حسین رضی اللہ عنہ) کے پیغام و عمل کی انقلابی معنویت سے شناسائی کی بدولت احمد فراز نے ہمیشہ جھوٹی روحانیت اور نمائشی وطن دوستی کا پردہ چاک کر کے حقیقی روحانیت اور سچی وطن پرستی کا بول بالا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ وطن کی شان میں جھوٹے قصیدے بلند بانگ مگر کھوکھلے ترانے بیچنے کے بجائے فراز وطن کی آزادی اور خود مختاری کی بقا اور وطن کے اندر حقیقی عدل و مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کی جدوجہد میں ایک بیدار دل و دماغ کے شاعر کا کردار ادا کرنے میں مصروف ہیں۔

پروفیسر فتح محمد ملک۔

احمد فراز کی شاعری کا جو سفر "تنہا تنہا" "درد آشوب" "نایافت" "شب خون" "میرے خواب ریزہ ریزہ" "جاناں جاناں" اور "بے آواز گلی کوچوں میں" ہوتا ہوا ہمارے بند ذہنوں کو ادراک بخشتا ہے وہ فنی اور شخصی دونوں حوالوں سے خاصا معتبر ہے۔ غزل اور نظم کے تناظر میں علائم و رموز کی زبان میں احمد فراز نے جو شاعری کی ہے وہ موضوعی اور فکری اعتبار سے اردو ادب کو قوت حرکت اور توانائی عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی۔

میں فراز کی اس لیے قدر کرتا ہوں کہ انہوں نے سرسید۔ حبیب جالب۔ اقبال اور فیض کی اس روایت کو جاری رکھا۔ کہ ماحول کے جبر کے خلاف فرد کو احتجاج کا پیدائشی حق ہے۔ ماحول کا یہ جبر کبھی تو جہالت کی فرسودہ روایات میں گڑا ہوتا ہے۔ کبھی معاشرے کی غلط اور ناہموار ساخت سے جنم لیتا ہے۔ کبھی مذہب کے غلط تصورات سے دوزخ کی آگ کی طرح ابلتا ہے اور کبھی اقتدار کے ایوانوں

سے زہریلی بارش بن کر برستا ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان میں یہ ساری صورتیں بیک وقت کار فرما ہیں۔ اور ہمارا فرد مایوسی کی انتہا تک پہنچ گیا ہے کہ بیدل کے الفاظ ہیں۔

شب رفت سحر نہ شد شب آمد

مسعود مفتی۔

شاعری کی طرح احمد فراز کی گفتگو بھی بڑی دل پذیر ہوتی ہے وہ نہایت ذہین۔ حاضر جواب۔ زیرک اور خوش گفتار انسان ہیں ان کے فقرے اور مکالمے۔ سادگی و پرکاری۔ سے مرصع ہوتے ہیں اسی لیے وہ جس محفل میں موجود ہوں شعر سنائے بغیر بھی مرکز توجہ بن جاتے ہیں۔ محفل کی بات چھوڑیے میں نے تو ان کے ساتھ تنہائی کئی گھنٹے گزارے ہیں اور جب نشست اختتام کو پہنچی تو یوں لگا ہے جیسے کسی بڑی پر رونق محفل سے اٹھ کر جا رہا ہوں۔

آغا ناصر۔

احمد فراز ان شعراء کی صف میں شامل ہیں جن کی مقبولیت کو حریفوں اور رقیبوں کی تصدیق بھی میسر ہے وہ کم و بیش 35 برسوں سے پیشہ ورانہ غوغائے ناقداں اور تاجرانہ گروہ بندی سے بے پرواہ اپنی مسافتوں کے روشن دائرے کھینچ رہے ہیں۔ ان کی گرہ میں اچھی شاعری کا وافر اثاثہ ہے۔ اس اثاثے کے لیے انہوں نے بڑی ریاضت کی ہے۔ فیض کے بعد غزل کو بانکپن اور تازہ کاری سے ہرا بھرا رکھنے میں فراز کا نام ایک اعتبار رکھتا ہے۔

نصیر ترابی

بہ حیثیت مجموعی احمد فراز دور جدید کے ان صف اول شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی فکر و نظر پختہ و بالیدہ ہے نظر وسیع اور مثبت ہے۔ ان کے یہاں جدید شعراء میں پائی جانے والی بے اعتدالی نہیں جو صرف لفظیات کے گورکھ دھندے تیار کرتی ہے اور قارئین کے لیے دردسر کا باعث بنتی ہے۔ احمد فراز کے یہاں صاف ستھرے الفاظ اور پاک خیالات میں فکر کی ایک ایسی تابش ہے جو احساس اور جذبات دونوں کی آمیزش اور الفاظ کے مناسب دروبست سے روشن ہوئی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس کے لیے مشق سخن کی ریاضت اور خون جگر کی آمیزش درکار ہوتی ہے۔ جدید لفظیات ترکیبات اور تشبیہات کے سلسلے میں بھی احمد فراز نے اپنی نظموں کو چیستان بنانے سے محفوظ رکھا ہے۔ انہوں نے جن ترکیبات سے کام لیا ہے وہ اچھوتی بھی ہیں اور خاص ان کی اپنی فکر کا نتیجہ نیز جہاں انہیں استعمال کیا گیا ہے سچ پوچھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نگینہ جڑ دیا گیا ہو۔

سید حسن عباس (ایران)

بھارت کے نامور فلمی
موسیقار نوشاد کے ہمراہ

صلۂ جنوں

فراز کی بیگم 'R' کا "حکم حاکم" سے لکھا گیا فراز کے نام خط۔ اس میں لفظ خون
آلود ہیں اور جذبے مجروح بے بسی کی پکار کے ساتھ بین السطور اعتماد اور فخر کا اظہار
بھی ہے)——— مسعود قریشی

Janu,

I hope this letter reaches you. I have been asked to write it to you. It is about the interview you gave in Toronto in which you allegedly used indecent and abusive language against some one. I was told that you have crossed all limits of decency and stooped to the level of vulgarity and damaged your image. Previously you had some well wishers here but now there is no one in the high circles to support you. You could be tried in absentia and your property could be confiscated. You also supported the action in a neighbouring country and declared the recent R as fraud etc. If you think that the present conditions are short lived you are grossly mistaken. It is going to stay. A campaign to malign you could be launched (your private life, family life, past reputation, character etc) both inside & outside which would expose your true image to the public. So far nothing has been done to harm your family but this state of affairs should not be taken lightly.

I had advised you previously to desist from giving inter-views or statements of any kind. Cant you restrain yourself for our sake. I have and am undergoing a lot of mental tension (not to mention the sense of insecurity of the child) Do you want us to suffer more for no fault of ours. What have you to gain or have you ever benefited for your actions and what have we in store for the future. What have you given us in terms of security and happiness, why take away whatever little is left with us. The strain is getting very unbearable. I would request you, infact implore you, to see reason, to sit quietly and concentrate on your writings only and for God's sake, keep your mouth shut. Keep these things to yourself only. In the words of Milton "Theyalso serve who only stand and wait."

ترجمہ

جانو۔

مجھے امید ہے یہ خط تم تک پہنچ جائے گا۔ مجھے کہا گیا ہے کہ میں یہ خط تمہیں لکھوں۔ یہ تمہارے ٹورانٹو میں دیئے گئے انٹرویو کے بارے میں ہے۔ جس میں مبینہ طور پر تم نے "ایک شخص" کے خلاف ناشائستہ اور دشنام آمیز زبان استعمال کی۔ مجھے بتایا گیا کہ تم شرافت کی تمام حدود توڑتے ہوئے بیہودگی کی سطح تک اتر آئے اور اپنے وقار کو مجروح کیا۔ قبل ازیں ارباب اختیار میں تمہارے کچھ بہی خواہ بھی تھے لیکن اب تمہاری اعانت کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ تم پر تمہاری غیر موجودگی میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے اور تمہاری جائیداد ضبط کی جا سکتی ہے۔ تم نے ایک ہمسایہ ملک کے اقدامات کی (مبینہ طور پر) حمایت بھی کی اور حالیہ R (ریفرنڈم) کو فراڈ قرار دیا۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ موجودہ حالات چند روز کی بات ہیں تو یہ تمہاری سخت بھول ہے۔ یہ صورت حالات قائم و دائم رہے گی۔ ملک میں اور بیرون ملک تمہارے خلاف الزام تراشی کی مہم شروع ہو سکتی ہے (جس کا حلقہ تمہاری ذاتی زندگی‘ خاندان‘ ماضی کی شہرت‘ اور تمہارے کردار پر محیط ہوگا) جس سے عوام تمہارا اصل چہرہ بے نقاب دیکھ سکیں گے۔ اب تک تمہاری فیملی کو نقصان پہنچانے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا لیکن صورت حال سنجیدہ بھی ہو سکتی ہے۔

میں نے اس سے قبل تمہیں کسی قسم کے انٹرویو یا بیانات نہ دینے کا مشورہ دیا تھا۔ کیا تم ہماری خاطر بھی ضبط سے کام نہیں لے سکتے؟ مجھ پر شدید ذہنی دباؤ تھا اور ہے۔ (بچے کے عدم تحفظ کے احساس کا ذکر نہیں) کیا تم چاہتے ہو کہ ہم اپنے کسی قصور کے بغیر مزید اذیت برداشت کریں؟ اپنی اس قسم کی حرکتوں سے ابتک تم نے کیا پایا اور مستقبل میں ہمارے لئے کیا ہے؟ تم نے آجتک ہمیں کیا تحفظ دیا؟ کیا خوشیاں دیں؟ جو کچھ تھوڑا بہت ہمارے پاس ہے اسے بھی کیوں چھین رہے ہو! دباؤ ہمارے لئے اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ میں تم سے درخواست کرتی ہوں‘ تمہاری منت کرتی ہوں کہ ہوش سے کام لو‘ چپکے بیٹھے رہو اور ادبی تخلیقات پر اپنی توجہ مرکوز کرو اور خدا کے لئے اپنی زبان بند رکھو۔ ان باتوں کو اپنے تک ہی رکھنا۔ ملٹن کے الفاظ میں "جو انتظار میں کھڑے ہیں وہ بھی خدمت سرانجام دے رہے ہیں" ہمیں تم سے محبت ہے---! R

کیڈٹ کالج کوہاٹ "فراز ڈے" بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محمد اجمل خان ستارہ امتیاز (ملٹری) تمغہ امتیاز (ملٹری) جناب احمد فراز کو کالج سووینئر پیش کر رہے ہیں

افسانہ

"قفس"

سعید شیخ

سب نرسوں کی باری باری رات کو ڈیوٹی لگتی تھی سوائے فوزیہ کے

یہ ہسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کا حکم تھا۔ دوسری نرسیں بڑبڑ ضرور کرتی تھیں مگر مجبور تھیں۔ بول نہیں سکتی تھیں۔ ایڈمنسٹریٹر بہت سخت منتظم تھے اور اپنے کسی بھی عمل کے لئے کسی اتھارٹی کو جوابدہ بھی نہیں تھے۔

نرسوں کے بارے میں ان کا دوسرا حکم یہ تھا کہ شام چھ بجے جوں ہی شام کا اندھیرا ہسپتال میں اترنا شروع ہوتا' سب نرسوں کو ادھر ان کوارٹروں میں بند کر دیا جائے جن کو لمبی سیڑھیاں جاتی تھیں جن کا صرف ایک دروازہ تھا اور جسے چوکیدار تالا لگا کر چابی کا چھلا گھما کر یوں مونچھوں کو تاؤ دیتا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑا کام سر انجام دیا ہو۔ یہ کوارٹرز اوپری منزل پر تھے جن کے نیچے پرلی طرف سڑک پر وہ دکانیں تھیں جن کا کرایہ اس ہسپتال کو چلانے کے لئے بہت سا فنڈ مہیا کرتا تھا۔

ان کوارٹرز کی بالکنیاں اندر ہسپتال کی طرف کھلتی تھیں یہاں کھڑی ہو کر فوزیہ رات گئے تک بولتی رہتی تھی۔

فوزیہ اصل میں اچھی بھلی عورت تھی وہ نرس کیسے بنی؟ بڑا متعلقہ سوال تھا جس کا جواب تلاش کرنے کی کسی نے بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

عورت وہ اس لئے نہیں تھی کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔

ہمارے ہاں جب لڑکی کی شادی کی عمر گزر جائے تو وہ خود بخود عورت بن جاتی ہے۔

اسی لئے اگلے روز جب ایک مریضہ کی عزیزہ نے اسے بہت توجہ اور محبت سے اس مریضہ کی دیکھ بھال کرتے دیکھا تو پوچھنے لگی۔

"کب شادی ہوئی تمہاری؟"

اسے یقین تھا کہ یہ نرس شادی شدہ ہی ہو گی۔

اس کے نزدیک ایک تو غیر شادی شدہ لڑکی کا جسم ایسا نہیں ہوتا اور دوسرے وہ کیسی بھی نرس ہو ایک ایسی مریضہ کی جو پچھلے کئی دنوں سے بے ہوش تھی' اس طرح دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔

اور جب فوزیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا

"نہیں! ماسی جی میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی!"

تو وہ عزیزہ بہت حیران ہوئی خاص طور پر اس لئے بھی کہ کسی بھی عورت یا لڑکی کے بارے میں اس کے اندازے کم ہی غلط ثابت ہوتے تھے۔ وہ تو لڑکی کے سانسوں کی رفتار سے اندازہ لگا لیتی تھی کہ پچھلی بار کتنے دن قبل وہ اپنے چاہنے والے سے ملی تھی اور اسے دن آئے کتنے دن ہو گئے تھے۔

اس کا بھی اتنا قصور نہیں تھا۔

فوزیہ بے شک نرس کی یونیفارم پہن لیتی تھی مگر اس کی جسمانی ساخت پکار پکار کر کہتی تھی کہ یہ لباس اس کے لئے نہیں بنا اسے تو کسی کی باہوں میں ہونا چاہئے تھا۔ فوزیہ کا جسم اس لباس کی قید سے آزادی مانگتا تھا اور برملا مانگتا تھا ایسے ہی جیسے کوئی بھی غلام غلامی کی زنجیروں سے آزادی مانگ رہا ہو۔ انہیں توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اسی لئے شام کو جب فوزیہ اپنی یونیفارم بدل کر عام عورتوں کا لباس پہنتی تھی تو ہسپتال میں پھرتے ایسے لگتا تھا کسی بڑے ہی بھلے گھر کی کوئی سہاگن اپنے محبوب کی تیمارداری کے لئے ہسپتال آگئی ہو۔

اس میں نرسوں والی کوئی عادت نہیں تھی۔ مریضوں کو سخت ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ ٹمپریچر لیتے انجکشن لگاتے نبض گنتے دوائی دیتے اس کی نگاہوں میں مریض کے لئے محبت اور امید کا پیغام ہوتا تھا۔ بے ہوش مریض کو ٹیوب کے ذریعے فیڈ دیتے ہوئے وہ یوں تیاری کرتی تھی جیسے اپنے بچے کے لئے دودھ کی بوتل تیار کر رہی ہو۔

کئی دفعہ وہ بعض مجبور اور معذور مریضوں کے کپڑے تک خود بدلواتی تھی صبح صبح ان مریضوں کے چہرے وہ خود گیلے تولئے سے یوں صاف کرتی تھی جیسے بچوں کو سکول بھیجنے کے لئے تیار کر رہی ہو۔

اور پھر مریضوں کے عزیزوں کو امید دلانا ان کو حوصلہ دینا اور ان کے دکھ درد میں شامل ہونا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا اور اس کے پاس ان سب کاموں کے لئے بہت وقت تھا۔

اس کی زیادہ ڈیوٹی بھی پرائیویٹ رومز پر تھی جہاں باری باری نرسوں کی ڈیوٹی بدلتی تھی مگر سب مریض بڑی بے چینی سے اس کے وقت کا انتظار کرتے تھے۔

وہ ان میں اس طرح گھل مل جاتی تھی کہ سوائے لباس کے پتہ نہیں چلتا تھا کہ اسے ان کا کام کرنے کا معاوضہ بھی ملتا تھا۔

پانچ نمبر کمرہ میں جو بوڑھی عورت پچھلے کئی دنوں سے بے ہوش تھی اور جسے ٹیوب کے ذریعے خوراک دی جا رہی تھی پیشاب کی نالی جسے لگی ہوئی تھی اور ڈرپ

دن رات چلتی تھی، فوزیہ یہ دیکھ کر حیران ہوتی تھی کہ کس طرح اس کے چار جوان بیٹے اپنی اپنی بیویوں اور بچوں کے ساتھ اس کو ہوش میں لانے کے جتن کر رہے تھے۔

ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا اب کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا ہے پھر بھی وہ قیمتی قیمتی دوائیاں لا رہے تھے اور ذرا وہ بوڑھی عورت کراہتی تھی تو سب اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

انہیں پتا تھا اب ان کی ماں مرنے والی ہے پھر بھی وہ اسے جدا ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

فوزیہ ان کی حالت دیکھ کر حیران ہوتی۔

اور اس نے ایک روز اپنی مٹھی بھر ساس کے کپڑے تبدیل کرتی بہو سے پوچھا۔

"ان کی کتنی عمر ہوگی؟"

"یہی کوئی پچاسی سال۔ مگر ماں باپ کی محبت کا حساب عمروں سے تو نہیں لگایا جا سکتا۔ ماں باپ کی تو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔" پھر بھی عمر کے حساب سے تو انہوں نے بہت اچھی زندگی گزار لی ہے اب اگر بچ بھی گئیں تو بستر سے شاید پھر بھی نہ اٹھ سکیں۔"

فوزیہ نے مریضہ کی ڈرپ میں انجکشن سے دوائی داخل کرتے ہوئے کہا۔

"بستر پر بھی رہیں گی تو بھی ہمیں دعائیں تو دیتی رہیں گی۔ ہمیں تو اب تک جو کچھ ملا ہے وہ سب انہیں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔"

فوزیہ مریضہ کی بہو کی بات سن کر کتنی ہی دیر سوچتی رہی۔

"میری ماں شاید جلدی مر گئی۔ اگر زندہ رہتی تو..... ہو سکتا ہے سلمان اب تک ڈاکٹر بن گیا ہوتا ہم سب بہنوں کی شادیاں ہو گئی ہوتیں۔ ہمارے اپنے اپنے گھر ہوتے جہاں ہم اپنے میاں کی ماؤں کی خدمت کیا کرتیں۔"

اور اس نے ان سوچوں سے بچنے کے لئے جلدی جلدی اپنا کام ختم کیا اور دواؤں کا ٹرے اٹھا کر اگلے کمرے میں چلی گئی۔

اگلے کمرے میں مریضہ نہیں تھی زچہ تھی

جس کی گود میں ابھی ابھی اس کا بچہ ڈالا گیا تھا۔ پچھلے دس بارہ گھنٹوں سے وہ انکیوبیٹر میں تھا۔ اس کا میاں کمرے میں کھڑا تھا اور زچہ کی ماں اسے کہہ رہی تھی

"عامر! تم ذرا باہر جاؤ زاہدہ نے بچے کو دودھ پلانا ہے۔"

اور زاہدہ کا میاں شرارت کر رہا تھا۔

"کیوں! میرے سامنے نہیں پلا سکتی؟"

اور زاہدہ دوپٹے میں اپنا منہ چھپا رہی تھی۔ اس کی قمیض بھیگ رہی تھی تم جاؤ نا باہر! تھوڑی دیر کے لئے!"

زاہدہ کی ماں نے زبردستی اسے کمرے سے باہر دھکیل دیا

فوزیہ محظوظ ہو رہی تھی۔

پھر اس کے سامنے زاہدہ نے اپنی قمیض اٹھائی اور اپنی گیلی چھاتی اس نوزائیدہ بچے کے منہ میں ڈال دی۔

بچے نے چسر چسر دودھ پینا شروع کیا تو ٹھیک وقت زاہدہ اور فوزیہ کے جسم میں جھنجھنے سے بج اٹھے۔

اوپر سے نیچے تک فوزیہ ان جھرجھریوں کی زد میں آ گئی حالانکہ بچہ زاہدہ کی چھاتی منہ میں لئے دودھ پی رہا تھا۔

فوزیہ کا رنگ گورا چٹا تھا۔ جو اب سرخ ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس نے مریضہ کا بلڈ پریشر چیک کیا۔ ٹمپریچر لیا اور غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ زاہدہ نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"پہلا بچہ ہے آپ کا؟"

"ہاں!" اس نے سنا۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی خواب میں جواب دے رہا ہو۔

فوزیہ نے دیکھا۔ ان کھلی آنکھوں میں عجیب چمک تھی چڑھی آنکھوں اور متبسم ہونٹوں والا یہ چہرہ فوزیہ کو بہت اچھا لگا۔

"تمہاری شادی کب ہوئی بیٹی؟"

زاہدہ کی ماں نے فوزیہ سے پوچھا۔

اور فوزیہ جواب دینے کی بجائے ہنسنے لگی اور اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پیشاب والا برتن ہاتھ میں لئے جمعدارنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی اس نے بوڑھی اماں کی بات سن لی تھی۔

"کہاں ہوئی جی سسٹر کی شادی!"

اور بوڑھی اماں کا منہ اور آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں اور وہ فوزیہ کے جسم کو بہت غور سے دیکھنے لگی جیسے اسے جمعدارنی کی بات کا اعتبار نہ آیا ہو۔

اور فوزیہ جلدی جلدی اپنے کام سے فارغ ہو کر اس کمرے سے نکل گئی تاکہ اس بوڑھی اماں کے مزید سوالوں سے بچ سکے۔ شاید اسے پتہ تھا یہ بوڑھی امائیں ہمدردی ہمدردی میں دوسروں کے زخم چھیڑ دیتی ہیں۔

اگلے کمرے میں جو مریضہ تھی وہ فوزیہ سے کافی مانوس ہو گئی تھی۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور اس ہسپتال کے ڈاکٹر نے اس کی ٹوٹی ہڈی کی

پلیننگ کی تھی۔

فوزیہ نے ٹمپریچر لینے کے لئے مریضہ کے منہ میں تھرمامیٹر چھڑک کر رکھا تو وہ فوزیہ کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہی۔

فوزیہ کا چہرہ ایسا تھا کہ اندر کی ہر کیفیت بہت جلد اس آئینے میں جھلکنے لگتی تھی۔ اور جونہی مریضہ کے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر فوزیہ اس سے ٹمپریچر پڑھنے لگی تو مریضہ نے کہا۔

"آج بہت اداس لگ رہی ہو! کیا بات ہے؟" فوزیہ نے خاموشی سے چارٹ پر ٹمپریچر ریکارڈ کیا اور مریضہ کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔

"میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

مریضہ نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس باجی! آپ لوگ بیمار ہوتے ہیں تو بھی آپ سے محبت کرنے والے چاہنے والے جیسے آپ پر قربان ہونے کو تیار رہتے ہیں ابھی شام ہو جائے گی یہاں آپ کا یہ کمرہ گھر کا کمرہ بن جائے گا آپ کے بہن بھائی عزیز یہاں جمع ہو جائیں گے۔ تکلیف جب بانٹ لی جائے تو کتنی کم ہو جاتی ہے اور ایک ہم ہیں.....؟

اور وہ خاموش ہو گئی۔

مریضہ مسکرا دی۔

"پہلے تم کو میں نے کبھی اس طرح بات کرتے نہیں سنا آخر ہمیں بھی یہاں آئے دو ہفتے ہو گئے ہیں۔"

"ہمیں تو دوسروں کا دکھ درد سنبھالنے کی اتنی عادت ہو جاتی ہے کہ اپنا دکھ بھول جاتا ہے لیکن جب رات ہوتی ہے تو پھر میں بہت اکیلی ہو جاتی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہیں نکل جاؤں بھاگ جاؤں کہیں بہت دور دکھ درد کی دنیا سے دور۔"

فوزیہ چارٹ مکمل کر چکی تھی۔

مریضہ کی دو بہنیں کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ خاموش ہو گئی ورنہ شاید وہ ابھی اور بولتی اتنی دیر میں بشیر ڈسپنسر اسے ڈھونڈتا وہاں پہنچ گیا۔

جلدی چلو بھئی فوزیہ! کمرہ گیارہ کی مریضہ کی ڈریسنگ کرنا ہے ویسے بھی تم جہاں جاتی ہو وہاں لمبی ہو جاتی ہو..... چلو جلدی!"

اور وہ اپنی دوائیوں اور اوزار کا ٹرے اٹھا کر بشیرے ڈسپنسر کے ساتھ چل پڑی۔ اگلے کمرے میں۔ اگلے مریض کے زخم دھونے۔

اور بشیرے نے برآمدے میں اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"کہو! تمہارے بھائی کا کوئی خط ٹیلی فون آیا۔ اب تو اس کا ہاؤس جاب بھی مکمل ہو چکا ہو گا!"

اگلے مہینے مکمل ہو گا۔ میری تو خواہش ہے سلمان یہیں آجائے۔ اسی ہسپتال میں یہاں گنجائش ہے۔ میں ٹرسٹ کے چیئرمین سے درخواست کر لوں گی پھر یہاں ہمیں علیحدہ گھر بھی مل جائے گا۔ میں اپنی دوسری بہنوں کو بھی یہاں بلوا لوں گی۔"

"اور پھر تمہیں ان نرسنگ کوارٹرز کی قید سے رہائی مل جائے گی جنہیں سر شام تالے لگا دیئے جاتے ہیں!"

بشیرے ڈسپنسر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

اتنی دیر میں فوزیہ کو احساس ہو گیا وہ بشیرے سے باوجود نہ چاہنے کے فری ہو رہی تھی۔

ہسپتال میں بشیرے کی شہرت اچھی نہیں تھی۔

اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ سسٹرز کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ فوزیہ کو اس کے کسی بھی سلوک کا براہ راست تجربہ نہیں تھا بس اس نے بھی یہی سنا تھا کہ بشیرا کہتا ہے یہ نرسز ہیں سسٹرز نہیں ہیں اور رہا اس کی نظر کا مسئلہ تو فوزیہ سمجھتی تھی نظر کا کیا پتہ۔ کسی کی آنکھ سے کیا پتہ چلتا ہے اس کے دل میں کیا ہے خاص طور پر جب یہ نظر مرد کی نظر ہو۔

ویسے بھی مریضوں کے بعد اس کی توجہ کا مرکز اس کا بھائی تھا جو دور ایک شہر میں ڈاکٹر بن رہا تھا جسے وہ مسلسل کئی سالوں سے خرچہ بھیج رہی تھی اور پیچھے گاؤں میں دو بہنیں تھیں جنہیں ماں باپ کی موت کے بعد اگرچہ چچا پال رہا تھا مگر جن کی بہت سی ذمہ داریاں اب بھی اس کی تھیں ان کی تعلیم اور دوسرے بہت سے خرچے بھی وہی برداشت کر رہی تھی۔

لیکن وہ بڑی بے چینی سے اپنے بھائی کے ڈاکٹر بن جانے کا انتظار کر رہی تھی اور اس بے چینی اور اضطراب کا اثر اس کے جسم پر اترنے لگا تھا پھر بھی اس کی زندگی میں اپنی ایک خوشی اور امید تھی اور اسی خوشی اور امید نے اس کے چہرے کی رونق اس کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کی مسکان کو مرجھانے نہیں دیا تھا۔

۔صبح کے وقت تو وہ خود کو بہت مصروف رکھتی تھی اور پھر بہت سے مریض تو اس سے اتنا مانوس ہو جاتے تھے کہ انہیں دیکھ کر اپنی بیماری بھول جاتی تھی۔

فوزیہ جب ڈیوٹی ڈاکٹر کے ساتھ کسی مریض کے سرہانے کھڑی ہوتی تو اس کے خواب جاگ اٹھتے۔ وہ تصور میں دیکھنے لگتی اس کا بھائی ڈاکٹر سلمان اس کے پاس کھڑا مریض دیکھ رہا ہے۔

فخر سے اس کا یونیفارم میں کسا ہوا سینہ اور بھی پھول جاتا اس کا سر اونچا ہو جاتا۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا۔

اسے یقین تھا سلمان کے ڈاکٹر بنتے ہی جیسے اس کے سارے خواب سارے ارمان پورے ہو جائیں گے۔

جس دن اسے سلمان کا ٹیلی فون آیا پانچ نمبر کمرے کی مریضہ نے اپنے سال گن کر پورے کر لئے تھے۔ وہ پر سکون ہو گئی تھی۔ اس کی ساری نالیاں اور ٹیوبیں اتار دی گئی تھیں اور اس کے بیٹے یوں رو رہے تھے جیسے یہ موت ان کے لئے بہت غیر متوقع تھی۔

اس کمرے میں ایک نئے مریض کو داخلہ مل گیا۔

فوزیہ آج بہت اداس تھی۔ جب بھی ہسپتال میں کوئی موت ہو جاتی تو اسے لگتا جیسے یہ ہسپتال والوں کی ناکامی ہو۔ ان کی نااہلی ہو۔

وہ پانچ نمبر کمرے کے مریض کو ڈرپ لگا رہی تھی جب دفتر کا چپڑاسی بھاگا ہوا آیا اور اس نے بتایا سسٹر کے بھائی کا فون ہے۔

سلمان نے اپنا ہاؤس جاب مکمل کر لیا تھا اور اب وہ کسی سینئر میڈیکل سپیشلسٹ کا اسسٹنٹ ہو گیا تھا اور انہیں کے ذاتی کلینک سے سلمان نے فوزیہ کو فون کیا تھا۔ فوزیہ کی ساری اداسی جیسے ختم ہو گئی۔ اگر نرسوں کے کوارٹرز کو تالا لگانے کا وقت نہ ہو جاتا تو آج وہ ساری رات ہسپتال میں ناچتی پھرتی۔

جب وہ اپنی یونیفارم اتار کر اپنی عورت کا لباس پہن رہی تھی تو نیچے سیڑھیوں کو رحمت خان تالا لگا رہا تھا۔ فوزیہ نے بالکنی سے سو روپے کا نوٹ نیچے پھینکا اور کہا "رحمت خان! مٹھائی لاؤ!! آدھی تمہاری..... آج میرا بھائی ڈاکٹر بن گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، بہن جی! لاتا ہوں اور آپ کو بہت بہت مبارک ہو!"

فوزیہ نے سب کمروں کی نرسوں کو اپنے کمرے میں بلا کر ان کی دعوت کی۔ وہ کل چھ تو تھیں۔ سب ملا کر۔

میرا بھائی لاہور کے بہت بڑے سپیشلسٹ کا اسسٹنٹ لگ گیا ہے۔

"تم تو پھر لاہور چلی جاؤ گی؟ اپنے بھائی کے پاس!"

"ہاں! مگر میں تم لوگوں کو ملنے آیا کروں گی۔"

فوزیہ نے جواب دیا۔

"وہاں تو تمہاری موج ہو گی۔ تمہاری بادشاہی ہو گی۔ یہاں کی قید سے تو جان چھوٹے گی۔"

دوسری نرس نے بڑی حسرت سے کہا۔

میں دیکھوں گی۔ وہاں اگر تم میں سے کسی اور کے لئے بھی جگہ ہوئی تو میں تم کو بلوا لوں گی"

وہ سب بھی فوزیہ کے ساتھ خوش ہو رہی تھیں۔

اگلے بہت سے دن مہینے اس نے اسی انتظار میں گزارے کہ کب سلمان کا پیغام آئے اور وہ لاہور روانہ ہو۔

اس نے تمام ڈاکٹروں کو یہاں تک کہ بشیرے کو بھی بتا دیا تھا۔ بشیرے نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"فوزیہ تم چلی گئیں تو اس ہسپتال سے شفا رخصت ہو جائے گی۔"

فوزیہ سمجھ گئی۔ اسے بشیرے کی بات بہت اچھی لگی۔ "مگر میں تو اسی دن کے لئے یہاں ٹھہری ہوئی تھی بشیرے! ویسے میں تمہیں بہت یاد رکھوں گی۔ ایسے ہی عملہ تمہیں برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ میں نے تو تمہیں بہت اچھا دیکھا ہے۔"

"تمہاری مہربانی ہے! اور نہ میں اتنا برا نہیں ہوں۔ میں تو بس یوں ہی بدنام ہوں۔ اور جو بدنام نہیں ہیں ضروری نہیں وہ نیک ہی ہوں۔ دلوں کے حال تو اللہ جانتا ہے۔ وگرنہ میں تو ایسی ایسی باتیں جانتا ہوں کہ تمہیں بتاؤں تو تم حیران رہ جاؤ۔"

بشیرا بولا

"مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ میرا تو مقصد ہی کچھ اور ہے بشیرے۔"

فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم ہنستی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ میں تو بڑے سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمہیں کسی بہت اچھے گھر کی رونق ہونا چاہیئے تھا یہ نرس کا کام تمہارے لائق نہیں۔ میرا مشورہ ہے تم جلدی شادی کر لو!"

اور فوزیہ ہنستے ہوئے کہنے لگی

"اس کا فیصلہ اب ڈاکٹر سلمان ہی کرے گا۔"

کئی دن ہو گئے۔ اسے سلمان کی خبر نہ ملی۔

اتنے دن کہ ڈاکٹر اور نرسیں اس سے مذاق کرنے لگے

"ابھی تک لاہور نہیں گئیں؟ بھائی نہیں لینے آیا؟"

اور بھائی اسے کیسے لینے آتا؟

اس کے سینئر میڈیکل سپیشلسٹ نے اسے پوسٹ گریجوایشن کے لئے باہر بھجوا دیا۔ اور اکیلے ہی نہیں ساتھ اس کی بیٹی عائشہ بھی گئی تھی۔

یہ تو اسے سلمان کے کلینک سے کسی نے ٹیلی فون پر بتایا تھا۔ اور وہ حیران تھی۔

سلمان اسے بتائے بغیر چلا گیا!

اسے اتنا بھی وقت نہ ملا کہ اپنی بہن کو خدا حافظ ہی کہہ جاتا اور پھر سلمان کا خط آیا۔

اس نے لکھا تھا اسے بڑے اچھے کالج میں داخلہ مل گیا ہے۔ دو سال کا کورس ہے جلد ہی وہ بھی سپیشلسٹ بن جائے گا اور پھر وہ بھی لاہور میں اپنا کلینک بنائے گا۔

اور فوزیہ بہت خوش ہو گئی۔ اس کا بھائی بھی سپیشلسٹ بن جائے گا پھر اس کا بڑا نام ہو گا۔ اس نے سب کو بتا دیا۔ بشیرے کو بھی۔ اور کئی مریضوں کو بھی۔

کمرہ پانچ کا بابا اب ہوش میں تھا۔ اس کے دو بیٹے اس کا اکثر پتہ کرنے آتے تھے۔ بابا کوئی زمیندار تھا۔

فوزیہ نے محبت سے ایک دن اس کا چہرہ گرم گیلے تولئے سے دھویا تو وہ کہنے لگا

"اتنی دیکھ بھال کرتی ہو میری مجھے یوں لگتا ہے میری بیٹی کی طرح ہو"

"وہ تو ہوں بابا جی! میں تو مریضوں سے رشتہ جوڑ لیتی ہوں تبھی تو ان کی خدمت کا مزہ آتا ہے"

"تنخواہ میں تو بندہ اتنا پیار نہیں کر سکتا!"

بابا جی نے محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

فوزیہ نے بابا جی کا ٹمپریچر لیا اور پھر بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے کہا۔

"ہمدردی اور پیار کا معاوضہ نہیں ہو سکتا بابا جی!"

ہاں! صحیح کہتی ہو۔ میرے بیٹے مجھ سے بڑی محبت جتاتے ہیں لیکن دونوں باری باری اکیلے میں مجھ کہہ چکے ہیں میں اپنا باغ اس کے نام ہبہ کر دوں۔ اس کے نام لکھ دوں۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

میری بیٹیاں بھی ہیں۔ ان کا بھی حصہ ہے میری زمین میں میرے باغ میں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر میرے پاس یہ جائیداد نہ ہوتی تو شاید آج لاوارث کہیں پڑا ہوتا۔"

"نہیں بابا جی! ایسا نہ سوچیں۔ وہ آپ کی اولاد ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے بیٹے ایسے نہ ہوں۔" فوزیہ نے مریض کا چارٹ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

تم بہت اچھی ہو۔ بہت اچھی سوچ رکھتی ہو۔

مگر جن دنوں میں بے ہوش تھا ان دنوں بھی میں نے انھیں اپنے کپڑوں کی تلاشی لیتے محسوس کیا تھا۔ کاش! میری کوئی بیٹی میرے پاس ہوتی اصل محبت تو بیٹیاں کرتی ہیں بے غرض اور بے لوث۔

"بالکل تمہاری طرح"

اور بابا جی کی آنکھوں میں محبت شفقت کا اظہار فوزیہ کو دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دوائیوں کا ٹرے اٹھا کر باہر نکلی تو بشیرا باہر اسے مل گیا۔

"کہو! بھائی کا کوئی پیغام؟"

"اس کے شاید امتحان ہوں۔ وہ مصروف ہو گا اسی لئے بہت دن ہو گئے کوئی خط نہیں آیا۔"

بشیرے نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا اور پھر سوچتے ہوئے چپ ہو گیا۔ الفاظ اس کے زبان سے واپس ہو گئے۔

اسے اپنے بھائی پر بڑا بھروسہ تھا۔

جب کبھی کبھار بھائی کے لئے اس کے دل میں کہیں کوئی گلہ شکوہ سر اٹھانے لگتا تو وہ سوچتی۔

میں نے اس کے لئے جو کچھ کیا وہ بہن کی محبت کا تقاضا تھا مجھے اتنی جلدی اب اس کے بدلے کی توقع تو نہیں رکھنی چاہیئے۔

سلمان سیٹ ہو گیا تو ہمارے لئے بہت کچھ کرے گا۔

ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ یہ بشیرا تو بکواس کرتا ہے۔ کہتا ہے تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔ شادی کر لو۔

اب اسے کون سمجھائے کہ میرے بھائی کی زندگی کا اس کے مستقبل کا مسئلہ ہے۔

فوزیہ کبھی کبھی سوچتے ہوئے بولنا شروع کر دیتی ہے اور اپنی ہی آواز سن کر ہنس پڑتی۔

مجھے بھی کیا ہو گیا ہے اپنے خیالوں پر قابو نہیں رہتا۔"

ایسے ہی ایک دن ایڈ منسٹریٹر صاحب نے کہا تھا

"کیا بات ہے فوزیہ تمہیں اب اپنے آپ پر اپنے جسم پر قابو نہیں رہتا۔ یہ ہسپتال ہے۔ یہاں اس طرح کے طور طریقے نہیں چل سکتے۔"

اور ایڈ منسٹریٹر کی بات پر اس نے آج سوچا

"اگر آدمی کو اپنے دماغ پر قابو نہیں رہتا تو جسم پر قابو کیسے رہ سکتا ہے۔"

"اسی لئے شاید رات کے آخری پہر کبھی کبھی میرا جسم چاہتا ہے میں اسے آزاد کر دوں۔ وہ کسی طرح فضاؤں میں اڑنے لگ جائے اسی وجہ سے کبھی کبھار نرس کی یونیفارم مجھے بہت تنگ محسوس ہونے لگتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے میں جلدی اس کی تنگی سے نکل آؤں۔

پھر فوزیہ کو پتہ چلا اس کا بھائی کورس مکمل کر کے واپس آ گیا ہے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ اسے سلمان کا ٹیلی فون تک نہیں آیا تھا۔

اس نے سوچا ابھی وہ سیٹ ہونے میں مصروف ہو گا۔

جونہی وہ سیٹ ہو گیا اس کا ذاتی کلینک بن جائے گا اور پھر فوزیہ وہاں چلی جائے گی۔ اپنے بھائی کے کلینک کی انچارج بن کر۔

اس نے سنا تھا وہ لڑکی جس کا نام عائشہ تھا وہ بھی سلمان کے ساتھ کورس کر کے آئی تھی۔

اور اس کے باپ نے ان کے لئے ایک خوبصورت سا کلینک بنانا شروع کر دیا ہے۔

اس نے بشیرے کو بتایا۔

باقی صفحہ 113 پر

افسانہ

جسٹس آف گاڈ

گلزار جاوید

ڈیئر جمی خوش رہو

بیٹا بھیجا ہم نے تمہیں ایجوکیشن کے لئے تھا مگر تم تو ہمارے ہی ٹیوٹر بن بیٹھے دیکھو نا چھوٹا ہونے کے باوجود تم نے خط میں ناصحانہ انداز اپنانے کی کوشش کی ہے جس کے لئے تمہیں اپنے خط میں بقراطیت اور فلسفہ بھی ٹھونسنا پڑا میں سمجھتا ہوں یہ خیالات تمہارے اپنے نہیں تمہاری سوچ کے پیچھے His Master's Voice دکھائی دیتی ہے--- بیٹا میں پند ونصاح کے خلاف نہیں اور نہ ہی میرا شمار قنوطیوں میں ہوتا ہے مگر مائی سویٹ سن میرے خیال میں آج کے مادی دور میں ان باتوں پر عمل کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے میرا دعویٰ ہے عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد تم اپنی اس سوچ کو حماقت جان کر ہنسنے کے علاوہ اپنی عقل کا ماتم بھی کرو گے میں اگر مبالغہ سے بھی کام لوں تب بھی تم میری جوانی کے مقابلے میں ایک بٹہ چار انقلابی بھی نہیں میری حقیقت پسندی کے پیچھے تلخ تجربات اور مشکل حالات کی طویل فہرست گنوائی جا سکتی ہے جس کا یہ موقع ہے اور نہ وقت میں اب بھی تحریر تقریر اور تبلیغ کی حد تک ان باتوں کا قائل ہوں مگر میرے عزیز بیٹے حقیقت کی دنیا سے ان باتوں کا دور کا بھی واسطہ نہیں---- تم ہی سوچو ایک ویل ایجوکیٹڈ بیٹے کا اپنی ممی سے یہ دریافت کرنا کہ ایک کروڑ تیس لاکھ کا بنگلہ اور پینتیس لاکھ کی موٹر خریدنے کے بعد پپا کے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی کہ آپ لوگ ورلڈ ٹور پر جا رہے ہیں اول تو تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم ہم سے اس قسم کے بے ہودہ سوالات کرو حق وناحق حلال وحرام کی تعلیم دو سچ تو یہ ہے بیٹا جو فضول باتیں تم نے لکھی ہیں اگر میں ان پر کاربند رہتا تو آج تم بیرون ملک تعلیم حاصل کرنے کے بجائے اپنے ملک کی کسی بدبودار گلی کی ٹٹ پونجیا درسگاہ میں ٹاٹ پر بیٹھے دقیانوسی کتابیں رٹ رہے ہوتے یا کسی مستری کی دوکان پر لوہا کوٹ رہے ہوتے میرے لخت جگر یہ انقلابات کا دور ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کے انقلابات کا دور صنعتی، معاشی اور ثقافتی انقلابات کا دور یہ دور تیز دوڑنے کا ہے جس نے ذرا سی بھی غفلت برتی وہ سدا کے لئے پیچھے رہ گیا اس تیز رفتاری میں وہی لوگ کامیاب وکامران ٹھہرتے ہیں جن کی نگاہ ہمہ وقت اپنے ٹارگٹ پر جمی رہتی ہے ہمارا معاشرہ اور باتوں میں بیک ورڈ سہی مگر اس معاملہ میں ہمارے ہاں زوردار طریقے سے مقابلہ جاری ہے یاد رکھو جنٹلمین حلال وحرام حق وناحق میں بزدل لوگ وقت ضائع کیا کرتے ہیں ان کی کم ہمتی انہیں ایسی فضول باتیں سوچنے پر اکساتی ہے میرے بلکہ ہر ہوش مند آدمی کے نزدیک آج کی سب سے بڑی حقیقت پیسہ ہر قیمت پر---- ڈاکٹر سے اپائنمنٹ کے سبب آج کی صحبت یہیں ختم کرتے ہیں تمہارے لئے سپورٹس کار بک کرادی گئی ہے شہر کے وسط میں تمہاری من پسند جگہ پر پلازہ کی تعمیر کے لئے پلاٹ خریدا جا چکا ہے۔ کنسٹرکشن کمپنی کی رجسٹریشن کی درخواست دی جا چکی ہے فیکٹری والے پلاٹ پر انڈسٹریل لون کی سینکشن ملنے والی ہے اور منیجنگ ڈائریکٹر کے طور پر تمہارا تقرر عمل میں آچکا ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

تمہارا پپا

جان سے پیارے جمی ڈارلنگ

سدا خوش رہو اور پھولوں کی طرح مسکراتے رہو

ہم لوگ بڑی شدت سے تمہارے خط کا انتظار کرتے ہیں اور تم اپنے خط میں نہ جانے کیا کچھ لکھ بھیجتے ہو تمہارے پپا کو اس قسم کی باتیں بالکل بھی پسند نہیں تم تو جانتے ہو وہ اپنے اصولوں کے کتنے پکے ہیں----- یہاں تو تم ایسے نہ تھے باہر جا کر خدا معلوم تم کیوں اتنے بیک ورڈ ہو گئے ہو تمہیں تو معلوم ہے تمہارے پپا کتنا ہارڈ ورک کرتے ہیں ڈاکٹرز کی ایڈوائس کے اگینسٹ ورکنگ شیڈول جاری رکھتے ہیں کس لئے--- کس کے لئے---- ہمارے لئے ڈیئر ہمارے لئے تمہیں پتا نہیں پچھلے دنوں ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کے مطابق ٹینشن لینے سے شوگر شوٹ اپ ہونے کے ساتھ کولیسٹرول کا لیول بھی ڈسٹرب ہو گیا تھا آج کل میڈیکل بورڈ جس میں فزیشن سائیکارٹسٹ اور ڈائی ٹیشن شامل ہیں ان کا ٹریٹمنٹ کر رہا ہے بریک فاسٹ میں دو سلائس براؤن بریڈ کے اور ایک کپ بلیک ٹی ود آؤٹ شوگر لیتے ہیں۔ لنچ میں مٹن یا چکن سوپ کے ساتھ ایک چپاتی کے علاوہ کچھ بھی نہیں لیتے ڈنر میں ڈاکٹرز نے سی فوڈ یا ویجیٹیبل سوپ لینے کو کہا ہے مگر وہ اوائڈ کر جاتے ہیں اکثر بلیک کافی کا ایک کپ لے کر بیڈ روم میں چلے جاتے ہیں۔ اور میرے کلب سے واپسی تک فائلز میں بزی رہتے ہیں۔ ڈیئر جمی ڈرنک اب بھی تمہارے پپا سے نہیں چھوٹ رہی ڈاکٹرز کے اسٹک لی بین کے باوجود "رائل سیلوٹ" یا "شیواز ریگل" کے ایک دو پیگ ضرور لیتے ہیں تم میری ہیلتھ کے بارے میں سنسینو لگتے ہو تبھی تم نے کچھ ایڈوائیز بھیجے ہیں میری اتنی فکر نہ کیا کرو سویٹ ہارٹ میں اب بیٹر فیل کر رہی ہوں ڈائٹنگ جاری ہے

Do you believe I lose my weight by Ten Poundes,

but waist is still Thirty Eight.

آج کل ایک پرابلم اور ہے سویٹ ہارٹ میرے نئے سلمنگ سنٹر کی ڈائریکٹر مسز جواد نے اپائنمنٹ بہت ارلی دی ہوئی ہے میں نے بڑی ریکوسٹ کی But she is so busy اب دیکھو نا گیارہ بجے سلمنگ سنٹر پہنچنے کے لئے ارلی مارننگ یعنی دس بجے صبح اٹھنا پڑتا ہے سارا دن ٹینشن میں گزرتا ہے تھک بھی جلد جاتی ہوں آج کل کلب کی ایکٹی وٹیز بھی برائے نام رہ گئی ہیں جلد واپسی کے باعث ساری فرینڈز مجھے ٹانٹ کرتی ہی۔ کہتی ہیں تم بیک ورڈ ہوتی جا رہی ہو بارہ بجتے ہی کلب سے چلی جاتی ہو کہتی تو وہ ٹھیک ہیں بیٹا بارہ بجے تو کلب کی ایکٹی وٹیز ٹاپ پر ہوتی ہیں۔ مگر کیا کیا جا سکتا ہے دل نہ چاہتے ہوئے بھی واپس آنا پڑتا ہے۔

حرارہ اچھی ہے تمہارے بھیجے ہوئے میوزک ایکوپمنٹ سے بہت انجوائے کرتی ہے۔ وہ بھی جلد خط لکھے گی دل تو نہیں چاہتا تم سے بچھڑنے کو مگر بیٹا مسز شاہ کے یہاں پارٹی پر جانا ہے تم تو جانتے ہو ان کی ناراضگی ہم لوگ افورڈ نہیں کر سکتے اجازت دو اپنا خیال رکھنا اور فون کرنا نہ بھولنا

گڈ بائی

تمہاری ممی

مائی ڈیئر جمی برادر

میری کرسمس اور ہیپی نیو ایئر

بائی دے وے تم نے کرسمس کہاں منایا اور ہیپی نیو ایئر کہاں منانے کا پروگرام ہے۔ You can't believe میں تمہیں کتنا مس کرتی ہوں لاسٹ ایئر ہم لوگوں نے کرسمس ریٹا کے گھر منایا تھا تم تو اپنی فرینڈز میں ایسے غائب ہوئے کہ میری خبر تک نہ لی اور میں اکیلی جمشید کی بور کمپنی برداشت کرتی رہی ایک بات ہے ڈیئر، جمشید اتنا ڈفر ہے نہیں جتنا نظر آتا ہے اور سیکنڈ لاسٹ ایئر یورپ کا ہیپی نیو ایئر تو میں کبھی نہیں بھول سکتی یاد ہے جب ہم لوگ سیون اسٹار ہوٹل کی گیارہویں فلور پر ہیپی نیو ایئر منا رہے تھے ایگزیکٹ بارہ بجے ہوٹل کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں ہم دونوں ایک دوسرے کے دھوکہ میں ڈورتھی اور فلپ سے گلے مل کر ہیپی نیو ایئر کہہ بیٹھے تھے تمہارا تو پتہ نہیں But I..... چھوڑو پرانی باتیں یہ بتاؤ آج کل تمہاری کیا ایکٹی وٹیز ہیں میرا مطلب ہے اسٹڈی جیسے بور کام کے علاوہ انجوائے بھی کرتے ہو کہ نہیں اب تک کتنی گرل فرینڈز بنائیں۔ دو کے نام ضرور لکھنا امید ہے میرا تعارف کرا دیا ہوگا میں بھی انہیں فون پر ہیلو کرنا پسند کروں گی بشرطیکہ تم نے فون نمبر دیئے کیونکہ تم ہمیشہ ہی اپنی گرل فرینڈز کو مجھ سے چھپاتے رہے ہو تم نے میری ایکٹی وٹیز کے بارے میں معلوم کیا ہے تمہیں تو پتہ ہے میں ہفتہ میں تین دن سے زیادہ یونیورسٹی جانا افورڈ نہیں کر سکتی اور لیکچر سننا تو میرے لئے دنیا کا بور ترین کام ہے جب سے ممی نے نیا سلمنگ سنٹر جوائن کیا ہے میری تو سختی آگئی ہے ممی کے ساتھ مجھے بھی ارلی اٹھنا پڑتا ہے البتہ ایک گڈ نیوز ہے وہ یہ کہ میں نے یوگا کی کلاس کے علاوہ ڈانس پریڈ بھی شروع کر دیا ہے بائی گاڈ بڑا چارمنگ ہے ہمارا ڈانسنگ ٹیچر پریکٹس کے دوران کئی بار وہ Just like U Bent ہو جاتا ہے اور مس سنیمنا تو اتنا ہے تھاؤزنڈ میٹر میں فرسٹ پرائز ایزی لی لے لے اور وہاں پارٹنر میرا بوائے فرینڈ تھا نا وہ کیا نام تھا اس کا فاری اس سے میں نے کٹ آف کر لیا ہے بڑا فلرٹ تھا وہ جانتے ہو اس نے کیا کیا مسز فاطمی کو ان کے برتھ ڈے پر ڈائمنڈ سیٹ پریزنٹ کیا اور میرے سامنے ان کے گلے میں اس چیپ انسان نے خود پہنایا اوہ مائی گاڈ جمی میں تمہیں بتا نہیں سکتی اس وقت میں کتنا ڈیپریس ہوئی ویسے علی رضا آج کل میرے اندر بہت انٹرسٹ لے رہا ہے ہر روز اپنی تھری ڈور رینج روور لے کر آجاتا ہے believe Me ہماری بی ایم ڈبلیو کے سامنے بہت ہی چیپ لگتی ہے اس بیچارے کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آج کل سوسائٹی میں Move کرنے کے لئے لینڈ کروزر، ہیٹرول، اکارڈ، مرسڈیز یا بی ایم ڈبلیو کا ہونا کتنا ضروری ہے وہ بیچارہ کیا کرے Due to Enquiry اس کے فادر پر ڈاؤن فال آیا ہوا ہے Again Good News for You کہ میں نے پہلے سے بہت امپروو کیا ہے Now I am 36-26-36 یونیورسٹی فیلوز میں میری اسمارٹنس کے بہت چرچے ہیں۔ جلد ہی یوگا اور ڈانس کی کیسٹ ریکارڈ کر کے بھیجوں گی تم بھی پلیز میڈونا کے کیسٹ جلد بھیج دو کٹی، کبرا اور فائزہ کی بھی ڈیمانڈ ہے لائف میگزین کا لیٹسٹ ایشو ہرگز نہ بھولنا اور فون کرنا تو تم واقعی بھول چکے ہو تمہیں بوریت سے بچانے کے لئے خط بند کرتی ہوں۔ God Bless You

حرارہ

ڈیئر پپا اور ممی

میں آپ لوگوں کو پہلے بھی کئی بار لکھ چکا ہوں کہ آپ مجھے بھول جایئے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے اس کے باوجود بھی آپ لوگ مجھے ڈسٹرب کرنے سے باز نہیں آتے میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ میں آپ کو اپنے تفصیلی حالات سے باخبر کرتا رہوں یہ لیٹر بھی میں جلدی میں لکھ رہا ہوں میں نے آپ کا گفٹ کیا ہوا فلیٹ سیل کر دیا ہے مجھے ڈرگس کے لئے ڈیلی کافی پیسہ چاہئے ہوتا ہے میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اس کے کمرے میں شفٹ ہو گیا ہوں۔ You Know یہاں پر لڑکے کا لڑکے کے ساتھ لو افیئر بہت ان ہے اور جان تو ہے بھی بہت خوبصورت۔ میں اس سے بہت لو کرتا ہوں۔ اب پاکستان میں تو یہ بات نہیں چل سکتی اور میں جان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا سو اب میں واپس نہیں آؤں گا ویسے بھی مجھے دن میں کئی بار ڈرگس لینی پڑتی ہیں۔

Don't worry I will be all right Love to Hrara Take care by

جمی

سفرنامہ

قسط: ۲۳

بحرِ اوقیانوس کے اُس پار

سید ضمیر جعفری

تیرِ نیم کش

ڈاکٹر عبد الرحمٰن صاحب کے مشاعرے میں جناب شباب کاظمی نے اپنے شعری مجموعے تیرِ نیم کش کا ایک نسخہ عطا فرمایا تھا۔ آج اس کے مطالعہ کی فرصت ملی۔ فرصت بھی کیا، دن بھر جہاں جہاں بھی گئے "کتاب ساتھ ساتھ رہی۔ نیویارک کی گلیوں میں بکھری ہوئی زندگی کے ساتھ ساتھ شباب صاحب کی شاعری میں بھی اس چھدری چھدری فرصت میں جھانکتے رہے۔ اچھا صاف ستھرا دل میں اتر جانے والا شعر کہتے ہیں۔ شباب کاظمی کچھ عرصہ واہ چھاؤنی میں رہے ہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب وہاں راز مراد آبادی اور نذیر احمد شیخ اور کرنل شیر محمد شاد نے جنرل فضل مقیم خان اور جنرل قمر علی مرزا کی سرپرستی میں مشاعروں کی ریل پیل کر رکھی تھی۔ شباب کاظمی کی شاعری نے اس زمین سے بھی توانائی اور رعنائی حاصل کی ہے جس کو بابر نے ---ایرانِ صغیر کہا تھا۔

بوسٹن----امریکہ کے لاہور-----کے تاثرات نے ذہن میں ہجوم کر رکھا ہے۔ اس مزدور کا مجسمہ بار بار نگاہوں کے سامنے آرہا ہے جو بوسٹن یونیورسٹی کی ایک عمارت کی تعمیر کے دوران حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ مجھے بے اختیار اپنے وطن کا نادرہ فن معمار---- مستری حاجی عبد العزیز یاد آگیا جس کی ہنر کاری کے حیرت انگیز نقوش شاہی قلعہ لاہور کے شیش محل، لاہور کی جلیل و جمیل سنہری مسجد اور مسجد وزیر خان کے گنبدوں اور محرابوں پر دلوں کو تابانیاں بخش رہے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں کتنے لوگوں کو معلوم ہیں کہ ہمارا یہ قابلِ فخر ثقافتی سرمایہ اس "مستری" کے کھردرے ہاتھوں کی خیرات ہے۔ نیویارک کی فلک بوس عمارات کے سائے میں اپنے وطن کے اس "عظیم مزدور ہنرمند" کے حضور میں چند اشعار کا نذرانہ خود بخود ذہن میں اتر آیا۔

------شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم
کھردرے پتھر ہوئے گُل رنگ تیرے ہاتھ میں
رنگ بن جاتے ہیں خشت و سنگ تیرے ہاتھ میں
صدیوں کے چہرے کو لالہ فام کرنا تیرا فن
اینٹ کو لچکا کے گُل اندام کرنا تیرا فن
معجزۂ فن سے رنگیں کر گیا دنیا کی کشت
سِل میں دل، پتھر میں پانی، خشت کے اندر بہشت
گاؤں کے کچے مکانوں کی طرح سادہ ہے تو
تو کہ اپنی سلطنت کا ایک شہزادہ ہے تو

سرور اقبال کی شاعری سے بھی ہنوز روح سرشار ہے۔ تبدیلی فطرت کا ناگزیر عمل ہے۔ تبدیلی کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ موت کا معاملہ اور ہے۔ لیکن جیتے جی صرف احمق آدمی ہی تبدیل نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ تبدیلی سے خائف رہتے ہیں وہ بے حد ناخوش لوگ ہوتے ہیں مجھے معلوم نہیں مشاعرہ میں کیا ہوا اور کیا نہ ہوا ---میں تو یہ جانتا ہوں کہ شعر روح کو آسودہ اور جسم کو متحرک کر دے-----کچھ عجیب کیفیت ہے۔ میں اپنے دل میں اپنے گاؤں کی "چوپال" بھی لئے پھرتا ہوں ---نیویارک میں اپنے "گیڑ کھو" (رہٹ) کی روں روں بھی سننا چاہتا ہوں۔ اور یہاں کے درختوں اور پرندوں کو بھی گلے سے لگا لینا چاہتا ہوں۔

ڈیور سے اقتان کا ٹیلی فون آیا کہ شکاگو کے مشاعرے والے آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر ہمیں تو اپنا شیڈول ہی جنوری فروری تک ادھر مصروف رکھے گا۔ پھر مجھے تو "پائل" کے آپریشن کے باعث کچھ دن مکمل آرام کا مشورہ بھی دیا گیا ہے۔ جاج نے فون پر بتایا کہ کوئٹہ سے احتشام نے ان لوگوں کی فرمائش لکھوا دی ہیں--- روبی۔ ضمارہ، شہ پارا، علی، عمر--- سبھی نے جوتوں کی فرمائش کی ہے--- نیویارک میں آج بڑی خنک ہوا چل رہی ہے۔

(18نومبر)

چڑیا گھر

حمیرا ناشتے کے بعد ہمیں چڑیا گھر دکھانے لے گئیں۔ سہ پہر کو ہم لوگ واپس آئے۔ کھانا بھی وہیں ایک ریستوران میں کھایا۔ جتنا بڑا ملک اتنا ہی بڑا چڑیا گھر--- جتنا بڑا چڑیا گھر اتنا ہی بڑا مگر مچھ۔ چوبیس ہزار سے زائد جانور اور پرندے---- 625ایکڑ زمین کے رقبے پر محیط---ڈیوڑھی پر یہ "اطلاع" آویزاں تھی۔ کہ ایک دن میں چڑیا گھر کی گشت کر سکتے ہیں----دیکھ نہیں سکتے۔ حمیرا چار چھ گھنٹے کی "جھلک" کے لئے گھر سے سیاحت کی منصوبہ بندی کر آئی تھیں کہ ہمیں کن کن راستوں سے کہاں کہاں جانا تھا۔ پرندوں درندوں کا بھی ان کی اہمیت کے مطابق

----"راشن" کرلیا تھا کہ (مثلاً شیر افریقہ کے اور غزال ہسپانیہ کے دیکھیں گے کہ بقول علامہ اقبال---عام ہیں اس دیس میں آج بھی چشم غزال)۔

صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک مردہ ہاتھی کے ڈھانچے کا ڈھیر نظر آتا ہے کہ----دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہے---- آنجہانی ہاتھی نے پینتیس برس کی عمر پائی تھی----چڑیا گھر----براعظموں میں تقسیم ہے۔ ہم افریقہ سے داخل ہوئے۔ ایک گاؤں سامنے تھا۔ پھوس کے چھونپڑے۔ کچے گھروندے۔ گلیاں ٹیڑھی میڑھی۔ وہی ہمارے کسی گاؤں کا منظر۔ باپ چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے---ماں نے چولہے پر ہانڈی چڑھا رکھی ہے۔ ننگ دھڑنگ بچہ انگوٹھا چوس رہا ہے---گاؤں سے نکلتے ہی آدمی ایک احاطے میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس کا نام "سیاہ دنیا" تھا۔ عمارت باہر سے بھی سیاہ اور---اندروں چنگیز سے تاریک تر----اس احاطے میں وہ پرندے اور جانور تھے جن کے سورج کے ساتھ کشیدہ تعلقات ہیں۔ جن میں---چمگادڑ سرفہرست تھی---اس سرسری گشت میں دنیا کے سینکڑوں معروف اور غیر معروف جانوروں کے درشن کر لئے۔ ہاتھی۔ شیر۔ گینڈے۔ سانپ۔ گوریلے۔ بعض سانپ اتنے موٹے تھے کہ وہ چل بھی نہیں سکتے تھے۔ گوریلوں کی خوراک کا "چارٹ" پڑھ کر ہمارے اپنے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس مضمون کی ہدایت ہر احاطہ پر آویزاں تھی کہ جانوروں اور پرندوں کو---کسی قسم کی خوراک نہ دی جائے۔ کیونکہ ان کی خوراک کے اوقات مقرر ہیں اور ان کو پرہیزی غذا دی جاتی ہے۔ گوریلوں سے "علیک سلیک" کرتے ہوئے تو واقعی یوں محسوس ہوا جیسے (بقول حفیظ جالندھری)---"اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔"

شام کو عزیزان شاہد رضوی اور جمیل نقوی مجھے اپنے ہاں "نیو جرسی" لے گئے۔ شاہد منگلا میں اچھا خاصہ مرغی خانہ چلاتے چلاتے چند برس ہوئے یہاں آگیا۔ اور اس نے اچھا ہی کیا۔ مرغیوں کو منگلا کی آب و ہوا کچھ موافق نہیں آرہی تھی۔ یہاں آکر اس نے اپنی محنت اور لیاقت سے نیویارک کے کاروباری حلقوں میں خاصے قدم جمالئے ہیں۔ دو موٹریں ہیں (ایک نئے ماڈل کی مرسڈیز) فلیٹ عمدہ اور کشادہ اور اپنا فرنیچر اعلیٰ اور وافر۔ بچے، ضیغم، سائرہ۔ مدیحہ سکول جاتے ہیں۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں پرہیزی غذا کھاتا ہوں۔ مگر فرخندہ نے کھانے کا میز طرح طرح کی "ڈشوں" سے بھر دیا------ان سے مل کر جی خوش ہو گیا۔ شاہد ہماری بھاوج کا بھانجا ہے۔ اور جمیل سے ہماری بھتیجی شاہدہ بیاہی ہوئی ہے۔ (19نومبر)

گاندھی امریکہ میں

نیو جرسی کے جس اسکول میں شاہد کے بچے پڑھتے ہیں۔ اس سرکاری درسگاہ کا نام مہاتما گاندھی کے نام سے موسوم ہے۔ ضیغم----جو پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے---بتا رہا تھا کہ اسکول کے مرکزی ایوان میں گاندھی جی کی ایک بہت بڑی تصویر آویزاں ہے۔ اور مدرسے میں ہر سال ان کی سالگرہ کی تقریب بڑے جوش و خروش سے منائی جاتی ہے۔ گاندھی جی کی کتاب زندگی-----بچوں کو سبقاً پڑھنا پڑتی ہے (جس میں ظاہر ہے کہ ان کے "سیکولر" نظریہ سیاست کا پرچار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوگا)----نیویارک شہر میں گاندھی جی کا مجسمہ بھی نصب ہے۔ پچھلی مرتبہ اس مدرسے کی گاندھی جینتی کی تقریب کی صدارت امریکہ کے مشہور بھارت نواز سیاسی لیڈر مسٹر سولارز نے کی تھی۔

اردو اخبارات

نیویارک سے اردو کے کئی پاکستانی اخبارات----روزنامے اور ہفت گاہی---شائع ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ جتنی سیاسی پارٹیاں پاکستان میں قائم ہیں، وہ سب کی سب امریکہ میں بھی موجود ہیں۔ مقامی برانچ عموماً کسی ایک شخص ہی نے سنبھال رکھی ہے۔ جہاں کہیں کوئی "دو لیڈر" کسی برانچ کی قیادت کے دعویدار ہو گئے وہاں خود پارٹی بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اخبارات سے تو یہی لگتا ہے کہ ہر پارٹی کم از کم بھی دو گروہوں میں منقسم ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کو اپنی "خانہ جنگی" سے ہی فرصت نہیں۔ دوسری عالمی جنگ میں ملایا کے محاذ کے انگریز سپہ سالار جنرل پرسیول اور اس کے نائب کماندار جنرل ہیتھ کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ یہ عاپس میں لڑتے رہے اور جاپانی سنگاپور میں آدھمکے----بہرحال اخبارات کا دم غنیمت ہے کہ وطن کی خبریں مل جاتی ہیں۔ اور پڑھنے کو غزلیں بھی۔

اگلے دن

ایک اخبار (محاسبہ) میں شہزاد احمد کا انٹرویو بھی تھا اور دو غزلیں دیکھیں۔ خود شہزاد صاحب بھی ان دنوں امریکہ میں ہیں۔ مگر ان کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ پاکستان کے بڑے بڑے سب اخبارات دوسرے دن نیویارک میں پہنچ جاتے ہیں اخبارات کا بڑا "ہیڈ کوارٹر"----کشمیر ریستوران میں سردار طاہر تبسم کا دفتر ہے۔

آج ایک غزل کہنے کی کوشش کی۔ صرف ایک شعر ہوا۔ اس سے بھی ہم مطمئن نہیں۔ شعر شائد کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ شاعر تھک جاتا ہے۔ اپنا ایک بہت پرانا شعر یاد آگیا۔

منزل اک رہرو کا تھک جانا ہے ورنہ زندگی
اک مسلسل رہ گزر، پیہم سفر کا نام ہے

شعر کہتے ہوئے میں پرندوں کی طرح چہچہانا چاہتا ہوں۔ مگر وائے یہ حسرت خام!

(20نومبر)

مجسمہ آزادی

نیویارک کا مشہور زمانہ ""مجسمہ آزادی" ------ امریکہ کی شناخت اور علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مجسمے میں امریکہ کے لوگوں کے نظریہ زندگی کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ یہ عظیم الشان مجسمہ ---- ہاتھوں میں آزادی کی مشعل اٹھائے ---- دریائے ہڈسن کے درمیان ایک چھوٹے سے ٹاپو میں کھڑا ہے۔ گزشتہ مرتبہ امریکہ آئے تو بھی جمیل الدین عالی ہمیں ایک بحری بجرے میں آزادی کی اس "دیوی" کے قدموں تک لے گئے تھے۔ آج عزیزم شاہد کے ساتھ ریاست جرسی کے ساحل کے رخ سے اس دیوی کے درشن کئے۔ ہم --- پورا "ٹبر" جمیل نوید اور بچوں کے ساتھ سر شام وہاں پہنچے۔ فرخندہ کھانے پینے کا وافر سامان بھی ساتھ لے گئیں۔ جو ہم نے "باغ آزادی" میں بیٹھ کر بڑی آزادی سے نوش جان کیا۔ "باغ آزادی" ---- "مجسمہ آزادی" کے سامنے کے ساحل پر ایک وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ایک خوبصورت چمن زار ہے۔ البتہ ایک گوشے میں جو فطرت کے قریب رہنے دیا گیا ہے۔ جنگلی خرگوشوں کے غول کے غول چوکڑیاں بھر رہے تھے۔ نیویارک شہر میں آدمی کا زمین سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ یہاں فطرت کی آغوش میں وہ رشتہ بحال ہو گیا۔ نیویارک میں جو زمین سکڑ گئی تھی یہاں وہ پھر کشادہ ہو گئی تھی۔ جس میں دل تنہائی کی رغبت کر سکتا ہے ---- "گمنام سپاہی" کا مجسمہ بھی اسی ساحل پر ایستادہ ہے۔ جیسے وہ "مجسمہ آزادی" کی حرمت پر پہرہ دے رہا ہو۔ مجسمہ تو "گمنام سپاہی" کا تھا۔ جیسے ہمارے کسی سپاہی محمد خان کا ہو۔ مگر آؤ بھگت کا یہ عالم ہے کہ جیسی شاندار یونیفارم اس کو پہنائی گئی ہے وہ لنکن نے بھی شاید نہ پہنی ہو۔ البتہ چہرے پر کچھ گرد آلود سی دھند ضرور تھی جو "گمنام سپاہیوں" کے چہروں پر مرتے وقت ہوتی ہے۔ اور آنکھوں کی آخری بینائی بھی اسی طرح ---- فرد ای طرح ٹمٹما رہی تھی۔ ---- وہ گھاٹ بھی یہاں سے کچھ دور نہیں جہاں امریکہ کی خانہ جنگی میں فوجوں نے پڑاؤ کیا تھا۔ سپاہیوں کی بارکوں کے چند چوبی سائبان بھی ابھی تک موجود ہیں۔ جن سے لگتا تھا کہ اس وقت کے امریکی سپاہی زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ اور نہانے کے لئے اگر فرصت ملتی --- سمندر کھلا تھا ----

سورج ڈھلا تو منظر اور زیادہ مسحور کن ہو گیا۔ ہم اس مقام پر کھڑے تھے جہاں سمندر دریائے ہڈسن سے گلے ملتا ہے۔ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ ہڈسن اور سمندر گلے ملتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کی دیکھا دیکھی زمین و آسمان بھی ایک دوسرے سے گلے ملنے لگ جاتے ہیں۔ دریا (یا ملے جلے سمندر) کے دوسرے کنارے پر ---- دور دور تک ---- نیویارک کی فلک بوس عمارتوں کے "روشن جھروکے" بجلی کی طاقت در روشنی کے سیلاب میں نہا رہے تھے۔ سیاحوں اور مسافروں سے بھرے ہوئے جگمگاتے ہوئے "بجرے" ---- سمندر (یا دریا) میں بھاگے پھر رہے تھے۔ زمین تو خیر خاموش تھی مگر آسمان مسلسل بول رہا تھا کہ ایک منٹ کے بعد کوئی آتا جاتا ہوائی جہاز افق پر پھیلی ہوئی سکوت کی جھیل کو درہم برہم کر جاتا تھا ---- یہاں سے رخصت ہوئے تو یوں لگا جیسے "مجسمہ آزادی" آوازیں دے رہا ہو کہ زمین آزاد ہے ہوا آزاد ہے۔ آسمان آزاد ہے۔ انسان آزاد ہے۔

(21 نومبر)

گوری کالی جھڑپ

کل کی دریائی سیر سے گویا دریا ہی ہمارے اندر امڈ آیا۔ جسم جیسے نمی سے بھر گیا ہو۔ حرارت بھی ہو گئی۔ اوپر سے آج بارش میں کچھ مزید بھیگ بھی گیا۔ صبح چہل قدمی کرتے کرتے ذرا دور نکل گیا۔ بارش نے آلیا۔ سر راہ ایک گورے اور کالے کو دست و گریباں دیکھ لیا۔ ہم تو خیر یہ تماشا دیکھنے وہاں رکے رہے۔ مگر یہاں کے لوگ کوئی خاص نوٹس نہیں لے رہے تھے جیسے یہ معمول کی بات ہو۔ پولیس نے دونوں کو آکر چھڑایا۔ دونوں کو باندھ لیا۔ موٹر میں بٹھا کر لے گئے۔ یہاں ہتھکڑی تو شاید لگائی ہی نہیں جاتی ---- شاہد کے ایک یونانی دوست ملنے آگئے۔ نوجوان ہیں مگر باتیں بڑے گہرے تجربے کی کرتے ہیں۔ ان کی ایک بات بہت پسند آئی کہ آدمی کو ایسی عورت سے شادی نہیں کرنی چاہئے جو شوہر سے بھی زیادہ افسردہ ہو ---- دن بھر پانی برستا رہا۔ (22 نومبر)

جمیل آذر کے تازہ انشائیوں کا پر لطف اور پر معنی انتخاب
رت کے مہمان
شائع ہو گیا ہے
ملنے کا پتہ: 172 ایچ بلاک اقبال ٹاؤن لاہور
بک سنٹر 32 حیدر روڈ راولپنڈی

گیتوُ کی گیتا

انوار شریف

کچھ تحریریں تخلیقی وجدان کے تحت اور کچھ قلبی کیفیات کے زیر اثر قرطاس پر منتقل ہوا کرتی ہیں ہماری یہ تحریر نہ تو خاکہ نگاری کی ذیل میں آئے گی اور نہ ہی مربوط تاثراتی مضمون کی صف میں شمار ہوگی یہ تو ہمارے دکھی دل کا نوحہ ہے جو خوش نوا و خوش آہنگ خوشبو کے بے وقت بکھر جانے کے باعث نوک قلم پر خود بخود منتقل ہو رہا ہے۔

جس طرح ہماری معاشرتی زندگی میں بے شمار موضوع اور مسائل تشنہ طلب ہیں اسی طرح پروین شاکر کی بے وقت اور ناگہانی موت کے اسباب و علل بھی وقت کی گرد میں آہستہ آہستہ دھندلاتے جائیں گے ہمارے خیال میں تو یہ پہلو بھی بحث طلب ہے کہ آیا پروین شاکر کار کے حادثے میں جاں بحق ہوئی یا اپنے معاشرتی جبر کے ہاتھوں مدت پہلے قتل ہو چکی تھی۔

ہم مشرقی لوگ اپنی معاشرتی اقدار اور روایات پر بہت نازاں ہیں اور مغرب کو اس کی آزاد روی پر طعنہ زن کیے رکھتے ہیں خامیاں اور برائیاں خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہر معاشرے کا حصہ ہوا کرتی ہیں مغربی معاشرے میں بھی جھول اور سقم پائے جاتے ہیں مگر بے عملی اور منافقت ہمارے نظام اور عمل میں ان سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہے ہماری زندگی کا پورا ڈھانچہ ریاکاری، جھوٹ اور منافقت کے زور پر چل رہا ہے ہم لوگ علم کی روشنی پاکر بھی گھور اندھیرے کی جانب گامزن ہیں عورت اور مرد اللہ تعالیٰ کی خوبصورت تخلیق اور یکساں صلاحیتوں کے مالک قرار دیئے گئے صنف نازک کو تخلیقی جوہر عطا فرما کر خالق دوجہاں نے اسے مرد سے برتر مقام پر فائز کر دیا مگر ہم لوگ ذہنی طور پر اتنے بونے اور تنگ نظر واقع ہوئے ہیں خود پر اشرف المخلوقات کا

لیبل سجانے کے باوجود صنف نازک کے باب میں ابھی بھی قرون وسطیٰ کے نظریات پر عمل پیرا ہیں آج بھی عورت ہمارے ہاں مرد کے سہارے کی اتنی ہی محتاج ہے جتنی صدیوں قبل تھی تمام تر حوصلے، عزم، ولولے اور لیاقت کے باوصف اس کا وجود اس کا دماغ، دل اور دل میں بسنے والے ارمان ہونے والے ناخدا کے رحم و کرم کے تابع ہوا کرتے ہیں۔ وہ اگر کم علم یا کمزور ہے تو ہماری انا کو خوب تسکین پہنچتی ہے اور ہم اپنی برتری جتانے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتے اگر وہ علم و ہنر میں ہم سے برتر اور صلاحیتوں میں اعلی ہے تو بھی ہمارے لیے باعث آزار ہے کیونکہ اس سے ہماری خودساختہ انا کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں ہم تو پشتوں سے اسے زیردست رکھنے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں۔ کہ اس کی آزادی یا برتری تو کجا، ہم اسے باوقار دیکھنے کے بھی روادار نہیں۔

زیادہ دور نہیں رواں صدی میں ہی ذرا پیچھے چلے جائیں، تو ہم دیکھتے ہیں کہ عورت کے لیے لکھنا پڑھنا یا گھر سے باہر نکلنا کتنا معیوب سمجھا جاتا تھا خواتین لکھنے پڑھنے کا شوق بالعموم قلمی یا فرضی ناموں کے سہارے ہی پورا کیا کرتیں اردو ادب میں محترمہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی جیسی بلند حوصلہ خواتین نے جرات کا اظہار کیا تو ان سے حوصلہ پا کر اردو شاعری نے بھی انگڑائی لی ادا جعفری، زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کے بعد پروین شاکر نے نہ صرف معاشرتی ناسوروں کے خلاف بھرپور قلمی جہاد کیا بلکہ اردو شاعری کو تازگی اور توانائی کے ساتھ ترقی کی جانب بھی رواں دواں کیا۔ پروین شاکر نے اپنی پیش رؤں کی روشنی کی شمع کو اتنی قوت اور شدت عطا کی کہ وہ بہت جلد اردو شاعری کے دل کی دھڑکن بن گئی اور یہی اس کا قصور ٹھہرا نابالغ اور نافہم ناقدین قلم اس کے مقابل میداں میں آ کھڑے ہوئے اور نوجوان نسل کو محبت کے نام پر بے راہ رو کرنے کا الزام اس کے سر مڑھنے لگے تعصب، تنگ نظری اور نفسانی کشاکش کے اس دور میں دلوں کو تسخیر کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار محبت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اور محبت بھی وہ۔ جس میں سخن فہمی اور ابلاغ کا بھرپور درس موجود ہو۔ پروین شاکر کا یہی کنٹری بیوشن کیا کم ہے کہ اس نے اخلاق باختہ ناولوں اور ڈائجسٹوں سے ہٹا کر ہماری نوجوان نسل کو خوشبو ---- صد برگ ---- خود کلامی ---- انکار اور ماہ تمام جیسے ادبی شہ پاروں کا قاری بنا دیا۔

سنا ہے وہ بچپن میں بڑی شوخ، چنچل اور بذلہ سنج ہوا کرتی تھی ذہانت اس کے انگ انگ سے پھوٹا کرتی کم عمر اور کم سنی میں ہی اس کے حوصلے بلند اور ارادے مضبوط ہوا کرتے وہ زندگی کو لذت کوشی کے بجائے مہم جوئی سے تعبیر کیا کرتی جس کے باعث تعلیم سے سچی لگن اس کے شاندار تعلیمی ریکارڈ سے عیاں ہوتی ہے دوران تعلیم اس کے ہر دل عزیز و ممتاز ہونے کا سبب اس کی بے پناہ ذہانت، علم اور فی البدیہہ شعر کہنے کی صلاحیت تھی وہ کم گو اور قدرے بردبار ہو چکی تھی مگر حساس طبیعت اور حسین خوابوں کی اب بھی اسیر تھی اپنی ہم جولیوں کی طرح مستقبل کے حوالے سے بہت سے خواب سجاتی اور ان کی تعبیر کے بارے سوچا کرتی لفظوں اور جذبوں کی شدت سے پہلی بار جب وہ پگھلی تب بھی اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جذباتی لمحوں میں بھی اس نے اپنی شفیق استاد سے راہنمائی چاہی جن کے اندیشوں وسوسوں اور نصیحتوں کے جواب میں اس نے فقط ایک جملہ کہا ”وہ مجھے خدا کا درجہ دیتا ہے“ کاش اسے انسانیت کے رتبے پر ہی فائز کیا جاتا۔

کس کس افتاد کا اسے سامنا نہ کرنا پڑا اس تعلق کو جوڑنے اور قائم رکھنے کے لیے وہ ہر مشکل اور رکاوٹ کو خندہ پیشانی سے جھیل کر آگے اور آگے بڑھنے کا عزم کر چکی تھی قدرت نے اسے اک اور حسین روپ ماں کا عطا کر دیا تھا وہ کچھ اور سنجیدہ ہو گئی تھی ننھا گیتو بہار کے حسین جھونکے کی مانند اس کی زندگی میں آیا اور اسے سرشار کر گیا وہ سمجھوتوں کی قائل نہ ہوتے ہوئے بھی سراپا ایثار بن چکی تھی۔

وہ تو ہر گھڑی ہر پل گیتو کے لیے میٹھے گیت گنگناتی اور اس کے مستقبل کے سہانے خواب سجاتی خود کو مٹا کر ناخدا کی دہلیز آباد رکھنے کا عزم کرتی قلم، قرطاس اور گیتو اس کی کل میراث تھے ان میں اس کا انہماک دیدنی تھا وہ خوشبو تھی سچی اور خالص جو ہوا کے سنگ چاروں اور پھیل کر دلوں کو تسخیر کر رہی تھی جُوں جُوں شہرت و ہر دل عزیزی کی چاندنی اسے اپنے جلو میں لے رہی تھی وُوں وُوں اس کے مزاجی خدا کا آنگن اس پر تنگ ہو رہا تھا وہ روایتی مشرقی مردوں کی مانند اسے اپنے کھونٹے کی گائے سے زیادہ اہمیت دینے پر آمادہ نہ تھا جبکہ وہ آزادی نہیں فقط جینے کا حق چاہتی تھی عزت کے ساتھ انا کے ساتھ زندگی بسر کرنا اور اپنے گھر کو جنت کا نمونہ بنانا اس کا سب سے بڑا خواب تھا وہ خون سے بہت ڈرتی تھی اس نے کبھی کسی کا بہتا خون اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا مگر اب اپنے ارمانوں کا خون اس کی اپنی ہی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا اور وہ خاموش تھی ------ کب تک وہ بے بس قیدی کی مانند صیاد کے در و بام سے سر ٹکرا کر لہو لہان ہوتی بقول خود اس کے۔

مرے بدن کو نمی کھا گئی ہے اشکوں کی
بھری بہار میں کیسا مکان ڈھتا ہے

اب اس کے سامنے دو راستے تھے ایک شہرت دولت اور چاہت کی طرف جاتا تھا اور دوسرا چیلنج محنت، ہمت، صبر اور تنہائی کی دعوت دیتا تھا۔ وہ سراپا ایثار بن گئی شمع محفل بن کر تسکین دل و دماغ کی بجائے ماتا کا بسنتی چولا پہن کر صدا کے لیے گیتو کی گیتا کا روپ دھار بیٹھی دنیا اور اس کے رنگ و بو اس کے نزدیک بے معنی ہو گئے۔ اس کی راہ میں بے شمار کانٹے اس کی استقامت کے آگے زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے آسمان سے اس کی رہنمائی خداوند عالم اور زمین پر اس کا ایک عالی ظرف نائب (جناب احمد ندیم قاسمی) نے اس کی راہ کو روشن تر کرنے کے لیے ہر امکانی جتن کر ڈالا اس کی منزل دور

مگراس کی دسترس سے باہر نہ تھی مردوں کے معاشرے میں مقابلے کا امتحان مردانہ وار مقابلہ کرکے اول درجہ میں پاس کیا اور خالصتاً مردانہ محکمہ کسٹم میں اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے کے باوجود تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور امریکہ کی دو اعلیٰ درس گاہوں سے کسب علم کرنے کے بعد تیسری کا قصد دل میں رکھتی تھی جہاں اس کے ساتھ اس کا گیتو بھی جدید علم سے فیضاب ہوتا اس کی بلند ہمتی اس کے مضبوط ارادوں کی نشاندہی کرتے ہیں وہ جلد بلکہ بہت جلد اپنی منزل پالینا چاہتی تھی جو اس کے ننھے اور معصوم گیتو کی کامیابیوں اور کامرانیوں سے مشروط تھی وہ گیتو کو بہت جلد بہت بڑا آدمی بنانے کے لیے اضطراری کیفیت میں مبتلا تھی جو لوگ اس کو قریب سے جانتے ہیں وہ اس امر کے شاہد ہیں کہ اس کی زندگی بہت عجلت اور بے چینی میں گزر رہی تھی وہ وقت کی قلت اور اہمیت سے کس قدر آگاہ تھی۔۔

موت کی آہٹ سنائی دے رہی ہے
کیا محبت سے بہت خالی یہ گھر ہونے کو ہے

بقول جناب احمد فراز ان کی کلیات کے لیے بصد اصرار "ماہ تمام" کا نام تجویز کرنا اور چند دنوں بعد یہی نام ان سے التجاً اپنی کلیات کے لیے مانگ لینا کتنا بے محل لگتا ہے فراز صاحب نے "ماہ تمام" کا نام سن کر درست طور پر فرمایا تھا میرا فنی سفر ابھی تمام نہیں ہوا پھر جب پروین نے فراز صاحب سے یہی نام اپنی کلیات کے لیے مانگا تو فراز صاحب اور بھی خفا ہوئے "بھلا تمہاری عمر یا فنی سفر کی اس لفظ کے مفہوم سے کیا مناسبت تم تو ابھی شعری سفر کی پر بہار مہکتی صبح کی مانند ہو جس نے ابھی بہت سے انمول غنچے کھلانے ہیں تم تو ابھی ادھ کھلی کلی کی مانند ہو جس نے وقت گزرنے کے ساتھ پھول بن کر کھلنا اور اردو ادب کا دامن تابدار کرنا ہے" مگر دنیا کے نامور اور جینئس تخلیق کاروں کی مانند وہ بھی حرص و ہوس کے کثیف تالاب میں شدید گھٹن کا شکار تھی جس کا اظہار اس کی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔۔

یہ دکھ نہیں کہ اندھیروں سے صلح کی ہم نے
ملال یہ ہے کہ اب صبح کی طلب بھی نہیں

ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مرحومین کی قطار اس قدر جلد اور اتنی طویل ہو جائے گی کہ ہمارے ساتھ اہل قلم، اہل علم، اہل دانش، ہی نہیں زندگی کے تمام طبقات ماتم کناں ہو جائیں گے دنیا کے ہر مذہب میں مرحومین کے لیے سوگواری کی معین مدت ہوا کرتی ہے ہم لوگ بھی کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہو جائیں گے پھر سے اپنے روز و شب میں مصروف ہو کر سوچیں گے کہ ہم نے پروین شاکر کی تجہیز و تدفین میں پورا پورا حصہ لیا سوئم میں بھی شریک رہے اس کی یاد میں منعقد کیے گئے اجلاسوں میں دھواں دھار تقاریر کیں چالیسوے پر بھی فاتحہ خوانی کرنا نہ بھولے جو ہمارے بس میں تھا کیا اب مرنے والے کے ساتھ مرا تو نہیں جاسکتا بجا ارشاد۔

اے میرے زندہ و سلامت لوگو (مخاطب اہل قلم برداری) خدا آپ کو تادیر شاد و آباد رکھے بس اتنی عرض ہماری آپ سے ہے کہ پروین شاکر کو مرحوم مت کہیے اور نہ سمجھیے بیشک وہ جسمانی طور پر ہم میں موجود نہیں مگر روحانی طور پر وہ ہماری برادری کی مستقل اور معزز رکن تھی' ہے' اور رہے گی اس کا بلیغ کلام اور منفرد اسلوب اردو ادب کی خالص اور نا مٹنے والی خوشبو کی مانند ہے اور ہمارا حبس زدہ ماحول ہمیشہ کی طرح آج بھی اس سوندھی اور سچی خوشبو کا اتنا ہی محتاج ہے جتنا اس کی زندگی میں ہوا کرتا تھا اس خوشبو کا خراج آپ ادا کرنا چاہیں تو معصوم گیتو سے محبت اور شفقت کا کوئی بھی موقع ہرگز نہ ضائع کیجیے ہمارا یہ عمل ہمارے قلب اور پروین شاکر کی روح دونوں کے لیے باعث تسکین ہو سکتا ہے۔

واہ پروین شاکر۔

ہم بھی عجیب لوگ ہیں یا تو بہار کریں یا
سارا چمن جلا دیا اک پرکاہ کے لیے

"گیتوں اور دوہوں کے عالمی انتخاب کی اشاعت"

راجستھان اردو اکادمی جے پور (انڈیا) ۱۹۹۴ء میں گیتوں اور دوہوں کا عالمی انتخاب شائع کر رہی ہے۔ ہند و پاک اور دوسرے ممالک کے شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے منتخب کردہ پانچ گیت پانچ دوہے مع مختصر سوانح فوٹو یا پاسپورٹ سائز تصویر برائے اشاعت جلد از جلد مندرجہ ذیل پتہ پر ارسال کرنے کی زحمت فرمائیں۔

انعام الحق
چیرمین
بیت الفضل ۲۵۲۷، آگرہ روڈ، جے پور - ۳۰۲۰۰۳ (انڈیا)

نشانِ راہ

محترمہ نیلوفر سلطانہ ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد اسلوب کی مالک ادیبہ اور سنجیدہ آہنگ کی بلند پایہ شاعرہ بھی ہیں آپ قومی زبان اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی مہارت سے شعر کہتی ہیں۔ گزشتہ دنوں نیشنل لائبریری آف پوئیٹری واشنگٹن (امریکہ) نے ایک عالمی مقابلہ شاعری منعقد کرایا جس میں امریکہ، یورپ، سری لنکا، بھارت، سنگاپور، سعودی عرب، اور دیگر ممالک سے قریب تین ہزار شعراء نے شرکت کی پاکستان کی نمائندگی کرنے والی واحد شخصیت محترمہ نیلوفر سلطانہ ان دس بہترین شعراء میں شمار کی گئیں جن کی تخلیقات کو اعلیٰ پائے کا گردانتے ہوئے انعام اور شیلڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔ جو یقیناً محترمہ نیلوفر سلطانہ کے ساتھ ہمارے لئے بھی باعث اعزاز ہے۔ ذیل میں ہم محترمہ کی وہی نظم آپ کی نذر کر رہے ہیں۔

(گلزار جاوید)

THE PREPOSTEROUS DISEQUILIBRIA

The world is an inferno cacophonous- the result inevitible,
of a disequilibrium poignant, between the sublime and vile,
Between demand and supply, between need and greed,
Because we clamour for what we have not,
Oblivious of what we have, temptations do beguile,
See the waif emaciated with offsprings numberless
Cursing the rambunctious siblings, stares at her begging bowl,
A childless rich woman in her sequined dress with a scowl,
Yearns for peekaboos, babycoos for a cherubic smile,
With all her glitz, gloss and glitter,
she is like a parched earth, arid and sterile
What grotesque contradictions, a vortex for human minds puerile
No magic salve, no abracadabra can cure the heart fragile,
of a mother whose son falls victim to the betanoire of a sniper hostile.
Who can venture the portrayal of her melancholy profile?

Ah! a mother has lost her son in the wilderness of selfishness,
on her deathbed memories of smiles fervid, of pranks juvenile.
Are alive, be she wizened and senile
Oh! the lost filial love, the relationships ephemeral,
The avarice the gluttonous, rapacious greeds do defile,
The hearts- a waft of pungent odour devours the fragrance sweet.
These fissures, chasms, bizarre distortions-futile.
The manacled slaves to their desires insatiable look like,
The zanies, the zombies, the yoyos, the dodos imbecile,
The men virile to their conscience supine are but servile,
The rich siezed with nighmares, insomnia, incubus, envys,
The plebian on a pathway sleeping with a composure infantile.
The rich in a mansion ornate curses his asphyxia, anorxia,
The urchin pounces on a bread stale Ah! how robust-agile,
Oh! the incongruities of ravenous greed, the splurges,
The rotundity of a glutton, the jocundity of the poor,
The denizons of the world, bewildered, as if in exile
The rapacious avarice makes the human mind, a cesspool putrid,.
What a penury of those who amass wealth pile over pile.
The belligerant greed deflowers, defoliates ravages
The sylvan splendours an exercise vacuous-futile.
We can glorify yes, purify our world, our country,.
Our vicinity, our hearts souls and imaginations febrile.
Let us do away with tresspasses, peculations usurpations
And sow the seeds of peace restore the idyllic times
make the barren earth verdant and fertile

NILOFER SULTANA

”عہد حاضر میں غزل کی اہمیت“

قرۃ العین طاہرہ

عہد حاضر کی ایک اہم خصوصیت افراتفری کی کیفیت ہے۔ جو ہر شخص کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ معاشی تقاضے، نفسیاتی الجھنیں، معاشرتی مسائل، سماجی برتری یا کمتری کا احساس، ذات کی اداسی، ہزارہا افراد کے ہجوم میں بھی تنہائی کا دکھ، سیاسی اتار چڑھاؤ اور اسی قسم کے دیگر مسائل، جن سے ہر فرد کا واسطہ پڑتا ہے۔ مسائل کی یورش کے سامنے اس عہد میں کسی بھی انسان کو مطمئن پانا ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ ہر فرد اپنی غیر مطمئن زندگی کے دکھ اور مسئلے کسی دوسرے شخص سے بیان کرنا چاہتا ہے۔ اس کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہونا چاہتا ہے لیکن اتنی فرصت کسے۔ اس برق رفتار زندگی میں جو چند لمحے فراغت کے نصیب ہو جائیں تو وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق گزارنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ کچھ پڑھنا جانتا ہے تو فارغ وقت میں عموماً دوسرے مشاغل کے ساتھ ساتھ مطالعہ کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ مطالعے میں بھی وہ یہی چاہتا ہے کہ طویل تر قصہ کہانیوں کے بجائے ایسی چیز منتخب کرے، جو کم وقت میں اسے مطمئن کردے، اس کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو، اور یہ احساس بھی بخشے کہ دنیا میں صرف وہی ایک غمزدہ اور مسائل میں گرفتار نہیں بلکہ یہ مسئلے یہ دکھ ہر ایک کا مقدر ہیں۔ اور یوں مطالعہ اسے تسکین دے سکے۔

ہر صنف ادب اپنی جگہ اہم ہے، لیکن غزل کی اہمیت جدید معاشرے میں گھٹی نہیں بڑھی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے نشیب و فراز اسے اتنی مہلت نہیں دیتے کہ وہ کسی کام میں طوالت اختیار کرے۔ ہوشربا داستانوں کے مقابلے میں ناول، ناولٹ، افسانے اور اب افسانچے اختصار کے پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے ہی وجود میں آئے ہیں۔ طوالت اب پسندیدہ نہیں رہی ہے۔ غزل کا ایک مختصر سا شعر بھی اپنی کمیت (Quantity) کے باوجود ایک مکمل کیفیت یا مزاج کا حال ہوتا ہے۔ اس کے دو مصرعے اپنے اندر مطالب کی دنیا لئے ہوتے ہیں۔ غزل کا یہ اختصار ہمارے عہد کی زندگی کے عین مطابق ہے۔ وہ موضوعات جو اشعار غزل کا مواد بنتے ہیں۔ نظم کی صورت میں پیش نہیں کئے جا سکتے۔ شاعر کا تجربہ بہت مختصر لیکن گہرا اور شدید ہوتا ہے۔ وہ مختصر ترین الفاظ میں اپنا ابلاغ چاہتا ہے کیونکہ وہ تجربہ اس کا ہی متقاضی ہوتا ہے۔ بعض اوقات شاعر کا احساس اتنا لطیف ہوتا ہے کہ نظم کی طوالت اس کے لئے مناسب نہیں ہوتی، کیونکہ طوالت جذبے کی شدت کو ختم کردیتی ہے۔ ہماری زندگی ایک مصروف زندگی ہے۔ ایسے میں غزل ہی مختصر ترین صنف سخن ہے، جو ہمارے ذہن و دل کو کم وقت میں تازگی و توانائی بخشنے کے ساتھ ساتھ نئے تجربوں سے روشناس کراتی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل نظم ہے۔ اس میں وضاحت و تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ اسی سے غزل کی معنویت اور ایمائیت مجروح ہوتی ہے۔

غزل کی اہمیت و ضرورت آج کا فرد اس لئے بھی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسی چیز پڑھنا چاہتا ہے، جو اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تسکین کر سکتی ہو۔ ہر فرد اپنی روزمرہ زندگی میں مختلف اوقات میں مختلف کیفیات سے دوچار ہوتا ہے۔ جہاں اسے معاشی الجھنوں کا سامنا ہے۔ وہیں اپنی ذات کی تنہائی کا بھی احساس ہے۔ واردات دل کی اہمیت سے بھی آگاہ ہے۔ اور غم جاناں سے متعلق جذبات کو بھی محسوس کرتا ہے۔ معاشرے کی ناہمواری پر بھی کڑھتا ہے۔ اور اخلاقی انحطاط و زوال کی وجہ سے فکر مند بھی ہے۔ ذہنی الجھنیں اسے بھی ستاتی ہیں۔ سیاسی پابندیوں کا بھی احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک، پانچ سات اشعار کی غزل پڑھتا ہے تو حیران ہوتا ہے اور مطمئن بھی۔ کیونکہ ان اشعار میں اسے وہی کچھ نظر آتا ہے جو خود اس کے ساتھ بیت رہا ہے۔ غزل میں انہی کیفیات کا بیان ملتا ہے، جن سے وہ خود دوچار ہے۔ ظاہر ہے شاعر بھی اسی معاشرے کا فرد ہے۔ شاعران جذبوں کی شدت سے متاثر ہوتا ہے۔ یہی تاثر ان اشعار کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔ جو سامع یا قاری کو بھی اس کیفیت و حالت سے اثر پذیر کر سکتا ہے۔ جس سے شاعر خود متاثر ہوا ہے۔ کیونکہ دونوں کا تعلق ایک ہی زمین اور ایک ہی معاشرے سے ہے۔ یہ درست سہی کہ غزل کے اشعار میں انتشار ہوتا ہے۔ لیکن ایک خوبصورت غزل کے اشعار ایک خاص قسم کا ربط لئے ہوتے ہیں۔ الگ الگ اشعار بھی اپنے اندر ایک مربوط کیفیت رکھتے ہیں اور پڑھنے والے کے لئے باعث تسکین ہوتے ہیں۔

غزل میں تجربے کا اظہار دوسری اصناف سے بہت مختلف ہے۔ کیونکہ اس میں تجربے کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی۔ غزل میں شخصی تجربہ ایک عمومیت کے ساتھ واضح ہوتا نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری کو اپنے تجربے کی جھلک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ قاری وہی چیز پڑھنا پسند کرتا ہے، جو اس کے مزاج سے بھی مطابقت رکھتی ہو۔ انسانی زندگی میں غم کی اہمیت جس قدر ہے اتنی خوشی کی نہیں۔

غم سے انسان کا سابقہ اکثر رہتا ہے۔ غم بھی تو ہزار ہیں۔ غم روزگار ہو یا غم جاں۔ غم جاناں ہو یا غم دوراں، انسان انہی سے فرار چاہتا ہے اور انہی میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔ خوشی کا وجود تو لمحوں پر منحصر ہوتا ہے جو اکثر جاتے جاتے اپنی نشانی کسی غم کی صورت میں دے جاتی ہے۔ غزل کا ایک اہم عنصر اداسی و رقت انگیزی ہے۔ غزل میں دیگر عناصر کے ساتھ ساتھ بے بسی و اداسی، رقت و مجبوری کی کیفیت بھی ہے۔ جو سب پر حاوی ہے۔ اسی طرح یہ کیفیت نہ صرف کہنے والے بلکہ پڑھنے والے کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ عہد حاضر کا انسان مادی طور پر جس قدر ترقی کے زینے طے کر رہا ہے، اسی قدر ذات کی تنہائی اور ماحول کی اداسی کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مطالعے کے لئے ایسی صنف کا انتخاب کرتا ہے، جو اس کے مزاج کی نفی کرنے کے بجائے اس کے ذہنی رویے کے عین مطابق ہو۔

ماحول کے بوجھل اثرات دور کرنے کے لئے فرد جب مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسی تحریر کا متقاضی ہوتا ہے جو چند لمحوں کے لئے پھیری والوں کی کرخت اور سخت آوازیں، ٹریفک کا شور اور مشینوں کی گھرر گھرر کی صدائیں معدوم کر دے۔ چنانچہ مطالعے میں بھی وہ نرمی اور لطافت کا خواہاں ہوتا ہے۔ نرمی کا احساس اور غنائیت (LYRIC) کی کیفیت اسے غزل ہی کے مطالعے سے حاصل ہوتی ہے۔

تنہائی میں دھیرے دھیرے غزل کے اشعار گنگناتے ہوئے دوسری فکروں سے آزاد ہو کر سکون و طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ غزل کی موسیقیت اس کے کھلے ہوئے اعصاب کو آرام پہنچاتی ہے۔ خواہ وہ غزل خود پڑھے، شاعر سے سنے یا کسی گلوکار سے۔ کہ غزل کی اپنی جگہ یہ اہمیت بھی مسلم ہے کہ یہ بہت خوبصورتی سے گائی جا سکتی ہے۔ شاعرانہ زبان (Poetic Diction) کا صحیح اندازہ غزل کے مطالعے کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ غزل کا یہ آہنگی تواتر (Rhythm) صنعتی و مشینی عہد کے فرد کے سماعی تخیل (Auditory Imagination) کے لئے بھی باعث تسکین ہے۔ کیونکہ غزل میں تلخ تجربات بھی کھردرے اور بے ڈھنگے انداز میں بیان نہیں کئے جاتے۔ اور اگر ایسا ہوتا ہے تو وہ غزل کی حدود سے باہر جا پڑتے ہیں۔

سیدھے سادے آسان لفظوں میں کیفیات زندگی کا بیان غزل کے حسن کو جہاں نکھارتا ہے۔ وہیں قاری کے لئے بھی یہ سادگی کشش کا باعث ہوتی ہے۔ ہر فرد نظام زندگی کی پیچیدگی سے ہراساں ہے۔ اس لئے صاف و سادہ اور آسان طرز تحریر پسند کرتا ہے۔ چار چھ صفحات پر مشتمل جدید افسانہ یا کوئی جدید نظم پڑھنے کے بعد اکثر وہ اپنی کم علمی اور کم فہمی کے احساس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ تحریر اپنی پیچیدگی، مخصوص اشاریت، علامات اور ابہام کی بنا پر اس کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے۔ جبکہ غزل کے اکثر و بیشتر اشعار خواہ سہل ممتنع کی مثال نہ ہوں، پھر بھی وہ آسانی سے پڑھتے ہی سمجھ لیتا ہے۔ اور یوں شعر کا تاثر بھی اس کی سادگی کی بنا پر تباہ ہونے نہیں پاتا۔ ایک مختصر شعر بھی ایک مکمل تاثر رکھتا ہے۔

غزل میں ماورائی عناصر بہت کم ہوتے ہیں، مثنوی ہو یا قصیدہ، ان اصناف میں کسی نہ کسی وجہ سے، خواہ اپنے ذاتی فائدے کے لئے یا داستان میں رنگ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ حقیقت سے بعید واقعات شامل کر لئے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ واقعیت (Realism) سے دور ہو جاتے ہیں۔ جبکہ غزل کے بیشتر اشعار واقعاتی صداقت (Factual Truth) پر مبنی ہوتے ہیں۔ غزل میں غیر حقیقی واقعات کی گنجائش کم سے کم ہے۔ اب وہ دور تو رہا نہیں کہ انسان تخیل کے سہارے وقت گزارے۔ آج کا انسان حقیقت سے آنکھیں چار کرنے کی جرات رکھتا ہے۔ حق گوئی پسند کرتا ہے۔ اور سچے جذبوں کی قدر کرتا ہے۔ یہ سب کچھ اسے غزل میں مل جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ دیگر اصناف سخن خواہ وہ قصیدہ ہو یا مرثیہ، مثنوی ہو یا مسدس، ان کے اشعار اس قدر آسانی سے ذہن نشین نہیں ہوتے جتنے کہ غزل کے اشعار زبان زد عام رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد سیماب صفت میں غزل کے سینکڑوں اشعار اکثر باذوق حضرات کو یاد ہوتے ہیں، جبکہ دوسری اصناف میں یہ مثال شاذ و نادر ہی ملے گی۔

غزل کے اکثر اشعار ذو معنی ہوتے ہیں۔ ایک ہی شعر کا اطلاق عشق حقیقی پر بھی ہو سکتا ہے اور مجازی پر بھی۔ شعر پڑھنے کے بعد ذہن میں جو بھی تاثر ابھرے۔ ضروری نہیں کہ وہ غلط ہو۔ کیونکہ ایک شعر بھی اپنے اندر کئی مطالب و معانی پوشیدہ رکھتا ہے۔ عہد جدید کے معاشرے میں سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے کردار سے نفرت، تعصب اور نفاق کی فضا پیدا ہو چکی ہے۔ اخلاقی، سیاسی و مذہبی انحطاط کا باعث عوام سے زیادہ رہنما ہیں اور رہنما بھی وہ جو اپنے خلاف ایک لفظ بھی سننے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ایسے میں اگر شاعر کو اپنی آزادی بھی پیاری ہے۔ اور وہ کچھ کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تو وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے غزل کہتا ہے۔ کہ بالکل وہی مضمون اگر وہ نثر میں بیان کر دے تو قابل گرفت ہو سکتا ہے۔ غزل کی قدیم روایت رہی ہے کہ شاعر خود پر کئے گئے ظلم و ستم بیان کرتا ہے۔ اگر اب بھی وہ اس عہد ستم میں خود پر اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں پر ہونے والے ظلم و ستم اور ناانصافیوں کا ذکر کرتا ہے تو وہ قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ یہ غزل کا مضمون خاص ہے۔ اس طرح غزل کے پردے میں وہ حدیث دل اور گلہ کج کلاہاں بڑی خوبی سے کر جاتا ہے۔ یہ کہنا بھی مناسب ہوگا کہ غزل کا ایک شعر صرف ایک مطلب رکھتا ہے لیکن ان گنت موقعوں پر پڑھا جا سکتا ہے۔

غزل کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس میں ہر عہد کے حالات کے رجحان کے بیان کی گنجائش ہے۔ غزل کی ابتداء عشق و محبت کے خیالات کے نظم کرنے سے ہوئی۔ وقت بدلتا گیا اور پھر شعراء نے اس کی مقبولیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس میں بلند

اخلاقی خیالات کو بھی جگہ دینی شروع کردی۔ اس کے بعد صوفی شعراء نے اس میں تصوف کے اسرار و رموز بیان کرنے شروع کئے۔ پھر فلسفیوں نے فلسفیانہ مسائل سے بھی غزل کو روشناس کرایا۔ تصوف ‘ اخلاق ‘ فلسفہ ‘ عشق اور دیگر اہم مسائل کو دو مصرعوں میں بیان کرنا غزل ہی کی خوبی ہے۔ غزل ہر دور کے حالات ‘ ماحول اور طرز معاشرت کی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس سلسلے میں دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کے شعراء کی غزلیات کی مثال دی جاسکتی ہے۔ قوموں کا عروج و زوال ‘ معاشرے کی اخلاقی پستی اور سلطنتوں کے قیام و فنا کا اندازہ اس عہد کی غزل کے پڑھنے سے ہوجاتا ہے۔ عہد حاضر کے حالات بھی غزل میں اسی صورت بیان کئے گئے ہیں ‘ جیسے کہ وہ ہیں۔ انتشار ‘ بد نظمی ‘ سیاسی صورت حال ‘ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے معنویت ‘ سماجی اقدار کی ناہمواری ‘ معاشی مسائل میں اضافہ ‘ دستور زباں بندی کا رواج اور ایسے ہی دیگر حالات و کیفیات کہ جن سے آج کا فرد گزر رہا ہے۔ آج کی غزل میں یہ سب کچھ موجود ہے۔

غزل مختصر ہوتے ہوئے بھی بڑی وسعت و گہرائی رکھتی ہے۔ کوئی موضوع ایسا نہیں جو اس کے دائرہ گرفت سے باہر ہو۔ انسانی جذبات و احساسات کے بیان کے علاوہ معاشرے کے بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتے ہوئے غزل نے عہد حاضر کے دیگر شعبوں کے مسائل کو بھی اپنایا ہے۔ آج کا فرد سیاسی و معاشی نفسیاتی و عمرانی اور فلسفیانہ مسائل سے دوچار ہے۔ غزل میں بھی انہی مسائل کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اور یوں غزل آج کے معاشرے کے فرد کے لئے ایک ایسی صنف سخن ہے جو اس کے تمام مسائل کی نشاندہی کرتی ہے۔

غزل نے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اور یہی غزل کے زندہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس کی توانائی کی کیفیت یہ رہی ہے کہ ہر عہد کے تقاضوں اور مسائل کو اپنے اندر سموتے ہوئے بھی غزل ‘ غزل ہی رہی ہے اور اپنے مقام سے ہٹی نہیں ہے۔

ہمارے عہد کی غزل صداقت و فکر سے لبریز ہے۔ اس میں سائنسی حقائق کا شعور بھی موجود ہے نئی غزل سچائی کے رنگوں سے نکھری ہے۔ جھوٹ و ریاکاری سے پر اس معاشرے کی سب سے بڑی ضرورت سچائی و صداقت سے لبریز سوچ کی ہے۔ آج کی غزل میں یہ عناصر موجود ہیں۔ جبکہ دوسری اصناف ایسی ہیں کہ جن میں روئے سخن کسی خاص فرد کی جانب ہوتا ہے۔ مثلاً قصیدہ و مرثیہ۔ اور بعض نظمیں تو لکھی ہی اسی خیال سے جاتی ہیں کہ کسی خاص فرد کو سنائی جائیں۔ اس کے برعکس غزل شاعر کے ذاتی تجربات و احساسات کا بیان ہے۔ شاعر جس تجربے سے گزرتا ہے۔ اسے پوری دیانت داری سے اشعار میں ڈھال کر غزل کو صداقت و سچائی سے لبریز کردیتا ہے۔ کسی خاص مقصد اور ذاتی فائدے کے خیال کے بغیر ‘ تصنع سے گریز کرکے وہ غزل کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے صداقت فکر اس کے حسن خیال کو بڑھاتی ہے۔

ہر عہد میں غزل کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے پیش نظر اس پر اعتراضات کے پتھر برسائے گئے ہیں سب سے زیادہ اسی صنف کو معتوب کیا گیا ہے۔ اردو شاعری کی آبرو اور خوشبو کو کمتر صنف سخن اور نیم وحشی صنف قرار دیا گیا۔ لیکن غزل ان تمام اعتراضات کے جواب میں مزید نکھر کر اور اپنے دامن میں موضوعات کی وسعت لئے ہوئے ظاہر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام تر خوبیوں اور اہمیت کے باعث اس کی ضرورت بڑھی ہے ‘ گھٹی نہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ فن و روایت سے انحراف کرتے ہوئے بھی ان سے اپنے تعلق کو منقطع نہیں کرتی۔ اور قدیم ترین شعری روایت کو جدید ترین معاشرے کے شعری تجربے سے اس طرح جوڑتی ہے کہ کچھ بھی نامانوس معلوم نہیں ہوتا۔ چنانچہ غزل روایت کا ایک ایسا تسلسل ہے جو اپنے عہد کی معاشرت سے الگ نہیں ہے اور یہی اس کی زندگی و اہمیت کا بہترین ثبوت ہے۔

قفس: ص[illegible] سے آگے

”بس ڈاکٹر سلمان کا کلینک مکمل ہونے ہی والا ہے۔
پھر میں لاہور چلی جاؤں گی۔ اور بشیرا وہاں ڈسپنسر کی جگہ تو ہوگی ہی میں تمہیں بھی وہاں بلوالوں گی۔“

بشیرا روز اس سے پوچھتا ہے۔

”کب چلوگی لاہور؟“

اور فوزیہ مسکرا کر کہہ دیتی ہے

”بس تم دیکھنا آج کل کی ہی بات ہے۔ میرا بھائی خود مجھے لینے آئے گا۔ تمہیں نہیں پتہ اسے ہم بہنوں سے کتنی محبت ہے!“

وہ اسی انتظار میں جئے جارہی ہے کون جانتا ہے اسکا یہ انتظار کہاں اور کب ختم ہوگا؟

قلمے وکتابے

کتاب : تہذیب کے زخم
مصنفہ : ثاقبہ رحیم الدین
مبصر : ڈاکٹر احسان احمد شیخ
طابع : پیپ بورڈ پرنٹرز (پرائیویٹ) لمیٹڈ 277، پشاور روڈ۔ راولپنڈی
ملنے کا پتہ : 9 جامی روڈ راولپنڈی کینٹ
صفحات : 144 قیمت : 80 روپے

بیگم ثاقبہ رحیم الدین کی ہمہ جہت شخصیت نہ اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج ہے نہ پاکستان کے سماجی حلقوں میں ان کا شمار ان گنے چنے معروف لکھنے والوں میں ہوتا ہے جنہوں نے بچوں کیلئے لکھا۔ اردو میں یہ صنف ادب افسوس کی حد تک تشنہ توجہ رہی غالباً ہمارے ادیبوں نے اس کی طرف اس لئے توجہ نہ دی کہ آج کے ادب میں جو تھوڑی بہت پذیرائی لکھنے والے کو ملتی ہے، بچوں کیلئے لکھنے والا ادیب اس سے بھی محروم رہتا ہے۔ ان حالات میں ثاقبہ رحیم الدین۔ میرزا ادیب اور حکیم سعید جیسی ہستیوں کا دم غنیمت ہے جو فی زمانہ نام و نمود خود غرضی اور نفسا نفسی کے طوفانوں کے آگے نونہالوں کیلئے محبتوں کے دیئے روشن کئے ہوئے ہیں۔

زیر نظر کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر وحید قریشی، محسن احسان، احمد ندیم قاسمی کے تاثرات اور مصنفہ کے لکھے گئے پیش لفظ پر محیط ہے۔ مصنفہ کے اپنے الفاظ میں یہ کتاب کسی خاص تقسیم کے تحت نہیں لکھی گئی پچھلے ایک دو سالوں کی تحریروں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ان کا یہ ایک جملہ کتاب کے مزاج کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ ان کی تحریر کی سادگی ہی کتاب کا حسن ہے اور اس کی بنیادی وجہ غالباً یہ ہے کہ بچوں کیلئے لکھی گئی تحریروں کی معصومیت پھولوں کی خوشبو، جگنو کی روشنی اور تتلیوں کے رنگ لئے ان کی بقیہ تحریروں میں بھی اتر آئی ہے مگر تحریر کی یہ سادگی کتاب سے اس کا ادبی مقام نہیں چھین سکتی۔ چند خاصے کے جملے ملاحظہ کیجئے۔

”آج مجھ پر یہ مشکل آن پڑی ہے کہ ابر بندھا ہے۔ پتوار ہاتھ میں ہے اور گہرے نیلے پانیوں سے پار اترا نہیں جا رہا ہے۔“

”بھلا انگلی میں ہیرے اور یاقوت کی انگوٹھی کس کام کی جب ہاتھ کی پور پور دکھ رہی ہو اور نس نس میں درد ہو“

کتاب کے دوسرا حصہ جسے انشائیہ نما کا نام دیا گیا ہے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ نحو کی اصطلاح میں انشائیہ وہ جملہ ہے جس میں سچ جھوٹ کا احتمال نہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مصنفہ نے یہ مضامین نحو کی یہی اصطلاح سامنے رکھ کر

تحریر کئے ہیں اور ان کا سچ چھپائے نہیں چھپتا۔

کتاب کے تیسرے حصے میں جسے افسانے کے نام سے منسوب کیا گیا ہے تین کہانیاں ہیں۔ کہتے ہیں ہر لکھنے والے کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی پہلو اس کی کسی نہ کسی تحریر سے جھانک رہا ہوتا ہے۔ نہ جانے کیوں یہ سیدھی سادھی معصوم سی کہانیاں پڑھتے ہوئے ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بین السطور مصنفہ کی آنکھیں پڑھنے والے کا جائزہ لے رہی ہیں کہ دل اس کے اندر چھپے کرب کو محسوس کر پایا ہے یا نہیں۔

کتاب کا آخری حصہ جو شخصیات کے موضوع پر ہے غالباً اس کتاب کا کمزور حصہ ہے۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائی، مرزا غالب، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، صادقین، اور مرزا ادیب ایسی عظیم شخصیات ہیں کہ ان کا سرسری سا جائزہ لینا غالباً ناممکن ہے کہ اختصار کو سامنے رکھا جائے تو ان کی شخصیت اور ان کے فن کا احاطہ نہیں ہو سکتا اور قاری کا احساس تشنگی بہر طور برقرار رہتا ہے۔

ادب کے قاری کیلئے یہ کتاب اپنی تحریر کی سادگی، جاذبیت اور برملہ ہونے کے ناطے، ہوا کا خوشبودار جھونکا ہے جو ذہن پر یقیناً ایک دھیما دھیما خوشگوار تاثر چھوڑتا ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

شاعرِ رومان

ایک لڑکے نے کہا یہ شاعرِ رومان کو
میری توبہ اب پڑھوں جو آپ کے دیوان کو

کل جو شعر اس میں سے اک غلطی سے میں نے پڑھ دیا
لڑکیوں کے ہاتھ سے بس پٹتے پٹتے ہی بچا

شاعرِ رومان نے فرمایا کہ برخوردارِ من
نقص کوئی شعر پڑھنے میں رہا ہے لازماً

شعر بالکل ٹھیک پڑھ دیتے جو چُن کر ٹاپ کا
سخت ناممکن تھا پھر پٹنے سے بچنا آپ کا

شیخ اور مولوی

گھر شیخ کے اک مولوی پہنچا جو اچانک   سو! شیخ نے ہولے سے یہ کہہ کر اُسے ٹالا
گھر والے تھے خوراک میں مصروف تکا تک   آئے ہیں تو آجایئے اب حضرتِ والا

حضرت نے کہا پٹ سے کھُجاتے ہوئے سر میں   گو بھوک نہیں پھر بھی مناسب نہیں انکار
رکھتے ہوئے اک مُرغِ مُسلّم کو نظر میں   چکھ لیتا ہوں تھوڑا سا کہ ہو جاؤں نمک خوار

اس واسطے چکھ کر بھی اوازار ہی ہو گے   یہ سُن کے کہا شیخ نے اے مولوی پیارے
یعنی کہ نمک خوار نہیں خوار ہی ہو گے   ڈلتا نہیں سالن میں نمک گھر میں ہمارے

* * *

غلام علی بلبل

بن گیا ہے دفتری کا گھر بھی دفتر کی طرح
ڈانٹتی رہتی ہے بیوی گھر میں افسر کی طرح

میم کی دو خوبیاں سب خوبیوں سے خوب ہیں
سخت ہے پتھر کی صورت نرم پوڈر کی طرح

ایشیائی پیار کی گفتار کی رفتار دیکھ
ست چھکڑے کی طرح ہے تیز موٹر کی طرح

مغربی میں جب پہن لیتی ہے مردانہ لباس
سر سے پاؤں تک نظر آتی ہے مسٹر کی طرح

کون کہتا ہے کہ ہے نازک بدن میڈم نساؤ
فیکٹری میں کام کرتی ہے وہ شوہر کی طرح

پیاز کے ٹکڑوں کی صورت۔ ہجر کے لمحے کٹے
اشکباری تھی مسلسل گھر کے شاور[۱] کی طرح

لوڈشیڈنگ۔ ہجر کی شب اور مایوسی کی دُھند
آ بھی جاؤ جانِ من بجلی کے پاوڑ[۲] کی طرح

اس کے پتھر دل میں بلبل آشیانہ کیا ہے
میرا گل رو سنگدل ہے سنگِ مرمر کی طرح

قطعاتِ نو

ڈش انٹینا

جناب شیخ اپنے وعظ میں روزانہ برسوں سے
سنائے جا رہے ہیں ایک ہی افسانہ برسوں سے
ڈش انٹینا کے رستہ روز آتی ہیں مرے گھر میں
وہ حوریں جن کے چکر میں ہیں یہ مولانہ برسوں سے

ڈائٹنگ

یقیں آتا نہیں آنکھوں پہ اپنی
کہ وہ کیا چیز یارو بن گئی ہے
دوائیں آزما کر ڈائٹنگ کی
سوزوکی سے بچارو بن گئی ہے

یو۔ این۔ او

چھین کے لو اپنی آزادی
ٹیبل ٹاک سے کیا حاصل ہے
خاک ملے گا "یو۔این۔او" سے
جس کے نام میں "نو" شامل ہے

سرفراز شاہد

---

[۱]: SHOWER
[۲]: POWER

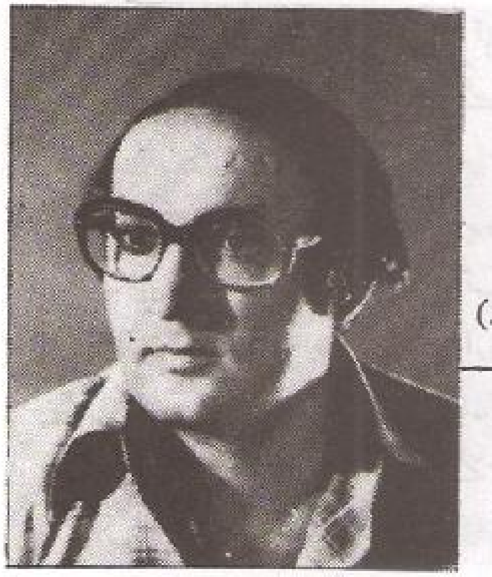

ناروے میں امجد اسلام امجد کے ساتھ ایک شام

(مصطفیٰ شان، اوسلو، ناروے)

پچھلے دنوں امجد اسلام امجد، انٹرنیشنل کلچر اینڈ آرٹس کونسل، اوسلو، ناروے کے صدر طاہر ڈار کی دعوت پر اوسلو، آئے تو ان کے اعزاز میں ایک تقریب اور مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ سیالکوٹ سے شیخ محمد اسلم اور گجرات سے افضل راز بھی ان کے ہمراہ تھے اوسلو میں قیام کے دوران احباب نے امجد اسلام امجد کے ساتھ شام منانے کا پہلے سے ہی اہتمام کر رکھا تھا۔ ادب، شاعری اور صحافت سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے بہت بڑی تعداد میں اوسلو کے ایک بڑے ہوٹل کے وسیع ہال میں جمع تھے۔ پروگرام کا آغاز "تلاوت کلام" پاک سے کیا گیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد سعید نے ادا کیے۔ سب سے پہلے کونسل کے چیئرمین محمد اسلم میر نے استقبالیہ پیش کیا۔ اور مہمان گرامی کو خوش آمدید کہنے کے ساتھ ساتھ ان کے علمی و ادبی مرتبے پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد اوسلو کی ہردلعزیز شخصیت افتخار چوہدری مرحوم (جن کا چند روز قبل انتقال ہو گیا ہے) نے امجد اسلام امجد کی شخصیت اور ادب کے میدان میں ان کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے انٹرنیشنل کلچر اینڈ آرٹس کونسل کے صدر طاہر ڈار کو بھی خراج تحسین پیش کیا جن کی کاوشوں سے یہ ادبی محفل انعقاد پذیر ہو سکی۔ انہوں نے بتایا کہ طاہر ڈار اوسلو میں ادب و ثقافت کی ترویج کے لیے گرانقدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور انہی کی کوششوں سے کونسل ہر تین ماہ بعد ایک معروف ادبی شخصیت پاکستان یا کسی دوسرے ملک سے اوسلو میں بلائی جاتی ہے۔ امجد اسلام امجد کا بلایا جانا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

مرحوم افتخار چوہدری کے بعد پاکستان سے آئے ہوئے نوجوان مہمان شیخ محمد اسلم نے جامع الفاظ میں امجد اسلام امجد کے فن پر اظہار خیال کیا۔ دوسری نشست مشاعرے پر مشتمل تھی۔ جس میں افضل راز کے بعد اوسلو کے گمنام شاعر مصطفیٰ شان نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں اپنا کلام پیش کیا اور خوب داد پائی۔ اس کے علاوہ نجیب نقوی اور مرتضیٰ زیدی نے کلام سنایا مرتضیٰ زیدی کے کلام میں نوجوانوں کے لیے مقناطیسی کشش اور جوش و خروش ہوتا ہے۔ سو اس کا مظاہرہ ہوا اور خوب ہوا۔ ان کے کلام کو سنا گیا اور بار بار سنا گیا۔

آخر میں مہمان خصوصی امجد اسلام امجد نے کلام پیش کیا۔ انہوں نے ہال میں بیٹھے ہوئے سامعین کی فرمائش بھی پوری کیں اور اپنا تازہ کلام بھی سامعین کی نذر کیا۔ سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو سامعین لکھ لکھ کر سوالات ان تک پہنچاتے رہے اور امجد صاحب ہر سوال کا تفصیلی جواب دیتے رہے۔ جس سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھتے اس کو بڑی ذہانت کے ساتھ لفظوں کے دائروں میں لپیٹ کر اس طرح پیش کرتے کہ سامعین کے پلے کچھ نہ پڑتا۔ ان کا یہ انداز بھی سامعین کو بہت پسند آیا۔ پروگرام کے آخر میں امجد اسلام امجد کی ادبی خدمات کے اعتراف میں، ان کی خدمت میں ایک ٹرافی اور پچیس ہزار روپے کی تھیلی انٹرنیشنل کلچر اینڈ آرٹس کونسل اوسلو، ناروے، کی طرف سے پیش کی گئی۔ تقریب کے اختتام پر کونسل کے صدر طاہر ڈار نے اسلم میر، اکرم شیخ، مرتضیٰ زیدی، شاہد ڈار، ڈاکٹر جاوید کاظمی، مصطفیٰ شان، زاہد خان، اندرپال جیت اور شاہد عزیز کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون سے یہ ادبی محفل انعقاد پذیر ہو سکی۔ آخر میں کونسل کے طرف سے تمام مہمانوں کے اعزاز میں ایک پر تکلف عشائیے کا اہتمام کیا گیا۔

دس رابطے

* * *

انور سدید برادرم گلزار جاوید صاحب

آپ کا ارسال کردہ ضخیم پیکٹ موصول ہوا۔ بندِ قبا کھولا تو طبیعت شاد ہو گئی۔ بے اختیار زباںؔ سے آپ کی محنت کی داد نکل گئی۔ مجھے حیرت اس بات پر بھی ہوئی کہ شہرت طلب ادبا کے ہجوم بے پایاں میں آپ کی نظر اس ناچیز پر کیوں پڑ گئی۔ اور کیسے پڑ گئی۔ مجھے تو ایک بہت بڑا طبقہ ناپسندیدہ شخصیت قرار دیتا ہے۔ Person a Non Grate سمجھتا ہے' آپ نے ادب کے ایک معمولی طالب علم کو "قرطاس اعزاز" عطا کر کے اسے اردو دنیا میں مقام امتیاز عطا کر دیا ہے۔ یہ تعریف بے طلب ملی ہے۔ یہ تحسین ایک ایسے حلقے سے ہوئی جس کی میں نے کوئی خدمت سرانجام نہیں دی۔ شاید اسی لئے خوشی بے پایاں ہے میری مسرت کی کوئی حد نہیں۔ میں سجاد نقوی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے دوستی کا حق ادا کیا اور آپ کے ساتھ اتنا تعاون کیا۔

دسمبر 94 میری چھیاسٹھویں سالگرہ کا مہینہ تھا۔ اس مہینے میں یہ گرانقدر تحفہ میری متاع بیش قیمت ہے۔

یہاں جن دوستوں نے بھی "چہار سُو" دیکھا وہ آپ کے انداز پیشکش سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے آپ کی ادب دوستی کی شہادت دی اور یہ بات بھی تسلیم کی کہ آپ جانبداری کے اس دور میں غیر جانبدار ہیں۔ گروہ بندی کے اس زمانے میں گروہ بندی سے ماورا ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ لطف آپ کے انٹرویو نے دیا۔ آپ نے تیکھے اور کڑے سوالات پوچھے میں نے سچ سچ جواب دینے کی کوشش کی۔ اب کچھ لوگ آپ سے ناراض ہو جائیں تو ان کی ناراضگی میرے کھاتے میں ڈال دیجئے اور مطمئن ہو جایئے کہ آپ نے ایک مدیر کی حیثیت سے ایک مصنف کے حقوق ادا کئے۔

عذرا اصغر

محترم گلزار جاوید صاحب

"چہار سو" آپ جس تسلسل' جانفشانی اور عمدگی سے نکال رہے ہیں اسکی داد دینا فرض بنتا ہے۔ اس لئے بھی کہ بطور خاص یہ ایسے مدیر کی حوصلہ افزائی ہے جو نفع نقصان سے بے نیاز ہو کر ادب کی آبیاری میں مصروف ہے۔ اور آپ نے تو پہلے دن سے ہی جو "گوشہ نوازی" کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے وہی کیا کم محنت طلب کام ہے؟ اللہ تعالٰی آپکی ہمتوں کو آپ ہی کی طرح جوان و توانا رکھے۔ آمین

یوں تو ابتک آپ نے جن نامور شخصیات کے فن و شخصیت کے رخ کی جھلکیاں قارئین ادب کو دکھلائیں وہ معلومات میں اضافے اور دلچسپی کا باعث ٹھریں اہم تخلیقکاروں کے گوشے اور نمبر یہ فائدہ تو طالبان علم و ادب کو پہنچاتے ہیں اور آپ کا حصہ اس کام میں اہمیت کا حامل ہے۔ اس حوالے سے تاریخ میں آپ نام بنا رہے ہیں ہمیں آپ پر رشک ضرور آتا ہے مگر حسد نہیں ہوتا۔

نومبر' دسمبر 94ء کے "چہار سو" میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کا گوشہ دیکھ کر مسرت ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے دوسروں کے لئے بہت کچھ لکھا مگر خود انکے لئے بہت کم لکھا گیا ہے۔ اس گوشے میں یہ دیکھ کر البتہ مجھے تعجب ہوا کہ کسی ایک بھی خاتون کا مضمون ڈاکٹر صاحب کی شخصیت و فن پر شامل نہیں کیا گیا۔ جانے یہ احتیاط دانستہ کی گئی ہے یا کوئی اور وجہ بنی ہے۔ لیکن آپ تو دعوت دے سکتے تھے۔ فرخندہ لودھی صاحبہ ڈاکٹر صاحب کے قریبی احباب میں شامل ہیں بلکہ گھریلو مراسم ہیں۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے کئی پہلوؤں سے قارئین کو روشناس کرا سکتی تھیں۔ جبکہ موصوف نے کبھی بھی کسی انداز میں انہیں نظرانداز نہیں کیا جائزہ ہو یا تنقید ڈاکٹر صاحب نے انکا نام اور کام ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا۔ بیشک ڈاکٹر صاحب صلے کی تمنا اور ستائش کی پرواہ نہ کرتے ہوں۔ میں ڈاکٹر صاحب سے گھریلو مراسم اور قربت کا دعویٰ تو نہیں کرتی البتہ انکی شفقتوں کی معترف اور ان سے عقیدت کی دعویدار ہوں۔ انکے مداحوں میں میرا بھی نام آتا ہے۔ میں ان سے اندھی عقیدت نہیں رکھتی بلکہ انکے اوصاف نے مجھے انکا مداح بنایا ہے۔ انکی تحریر کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دشنام سے آلودہ نہیں ہوتی۔ انکا قلم کبھی شائستگی کا دامن نہیں چھوڑتا۔

سچ پوچھئے تو حق پرستوں اور حق بات کہنے والوں کی مخالفت ازل سے ہوتی آئی ہے میں تو حضرت علیؓ کے اس قول کو ایمان کا جزو مانتی ہوں کہ "جسکا کوئی دشمن نہیں وہ منافق ہے۔" اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر انور سدید صاحب کے مخالفین کی تعداد انکے مداحین سے کہیں زیادہ ہے اور اسی خوبی کو میں انکے کردار کی بلندی کہتی ہوں اور یہی خوبی انکی سچ گوئی کی دلیل بھی ہے۔

ممتاز مفتی صاحب نے انکے بارے میں اپنے مخصوص خوبصورت انداز سے سچی باتیں کی ہیں۔ ممتاز مفتی صاحب خود سچ کہنے کے مرض میں مبتلا ہیں۔ میں انکی بھی عقیدت مند ہوں سچ واقعتاً بیحد کڑوا ہوتا ہے۔ مگر میری مجبوری یہ ہے کہ سچ برملا کہہ دینے والے مجھے بہت پسند ہیں۔ جو اپنی ذات سے بے نیاز اور راست گو ہوتے ہیں۔ "براہ راست" میں ڈاکٹر صاحب کا ارشاد کتنا درست ہے۔

میں نے ادب میں وزیر آغا کو پایا' قاسمی صاحب کو کھو دیا۔ صحافت میں وزیر

آغا کو کھو دیا قاسمی صاحب کو پالیا۔ ادب میں وزیر آغا اور صحافت میں قاسمی صاحب میرے آئیڈیل ہیں۔ میں نے ان دو سرچشموں سے مقدور بھر فیض اٹھایا ہے۔ آپ حیران نہ ہوں بعض اوقات زانوئے تلمذتہ کئے بغیر بھی فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ قاسمی صاحب کے آفتاب جلال کی کرنیں میں نے دور سے محسوس کیں۔ وزیر آغا کے علم کی چاندنی میں غسل ماہتابی کرتا رہا۔"

اس پیرے پر تبصرہ نہیں کرونگی۔ پڑھنے والے خود انکی صداقت کو محسوس کرینگے۔ بشرطیکہ تعصب کی عینک اتار دیں۔ بعض مرتبہ شاید نادانستہ طور پر کچھ حقائق کا اظہار نہیں ہو پاتا۔ جیسا کہ "براہ راست" میں ہی "اردو ادب میں انشائیہ" کو ڈاکٹر صاحب نے پہلی کتاب قرار دیا ہے جبکہ ڈاکٹر بشیر سیفی صاحب کا دعویٰ ہے کہ انکی کتاب "اردو میں انشائیہ" پہلی کتاب ہے۔ اور یہ انکا تحقیقی مقالا ہے۔ مزید یہ کہ اسکا مسودہ وہ یعنی ڈاکٹر بشیر سیفی ڈاکٹر انور سدید کو دکھا چکے تھے۔ مگر سوئے اتفاق "اردو ادب میں انشائیہ" پہلے چھپ گئی مشکور حسین یاد صاحب کی "ممکنات انشائیہ" کو بیشک رد کریں لیکن تذکرہ تو کرتے ہیں خیر یہ ادبی اختلافات ہیں جنہیں صحتمند ادبی رجحان تک ہی محدود رکھنا چاہئے۔

اس سلسلے میں صحیح جواب تو ڈاکٹر صاحب موصوف ہی دے سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر بشیر سیفی کا گلہ بھی میرے خیال میں غلط نہیں ہے۔

ڈاکٹر احسان احمد شیخ صاحب افسانوی ادب میں نووارد ہیں یا میں بے خبر رہی ہوں مگر انکے جو دو افسانے میری نظر سے گذرے ہیں مجھے اپنا معترف بنانے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک افسانہ جو انہوں نے میرے غریب خانے پر "بزم تجدید" میں پڑھا تھا اور ابھی تک متنازعہ ہے۔ اسے میں "تجدید" میں چھاپ رہی ہوں۔ دوسرا "مردہ خانے کا انسان" انکی دوربینی او جزیات نگاری نے مجھے حیران کر دیا۔ افسانہ کی بنت اتار چڑھاؤ تکنیک منظر کشی اور ابتداء سے لیکر اختتام تک تسلسل اور کرداروں کی پلاٹ سے ہم آہنگی انکو کہنہ مشق افسانہ نگاروں کے مقابل کھڑا کر رہی ہے۔ میں انہیں افسانے کی دنیا میں خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ میری جانب سے مبارکباد پہنچا دیجئے۔

آپکے لئے تو یہی کہونگی کہ ادبی مجلہ نکالنا اور پھر نکالتے چلے جانا "غم نداری بز بخر" کے مصداق ہے۔ تاہم آپکی ہمتوں کے لئے بہت سی نیک خواہشات کے ساتھ

نیساں اکبر آبادی

گرامی قدر گلزار صاحب

ڈاکٹر انور سدید صاحب کے شمارے کی بابت لکھنا چاہتا تھا مگر پروین شاکر کی بے وقت موت نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تسکین دل کے لئے ایک قطعہ کہا ہے جو نذر چہارسُو ہے۔

قطعۂ تاریخِ وفاتِ پروین شاکر خوشگو شاعرہ

پروین شاکر آج ترے جی میں آئی کیا
دنیا سے کر گئی ہے جو تو یک بیک سفر
ناپائیدار زیست ہے اِسکا ہوا یقیں
"چھائی خزاں جو آج بہارِ شباب پر"

شمیم صبائی متھراری

مکرمی و محترمی گلزار جاوید صاحب

پروین شاکر کی الم ناک موت کے باعث ان کی شخصیت اور فن پر مرتب کیے گئے چہارسُو کے منفرد شمارے کی داد دینے کے بجائے مرحومہ کے لئے ایک قطعہ تاریخ سوگوار دل کے ساتھ ارسال کر رہا ہوں۔

"شاعرۂ شیریں دہن پروین شاکر"

۱۹۹۴ء

سوچتا تھا جو میں تاریخِ فراق پرویں
وہ پکاری کہ نہ سوچو میں کدھر جاؤں گی
اور "وادیٔ ابد" سے کہی اپنی تاریخ
۲۸
میں تو خوشبو ہوں ہواؤں میں بکھر جاؤں گی

۱۹۶۶ء + ۲۸ = ۱۹۹۴ء

زبان بندی

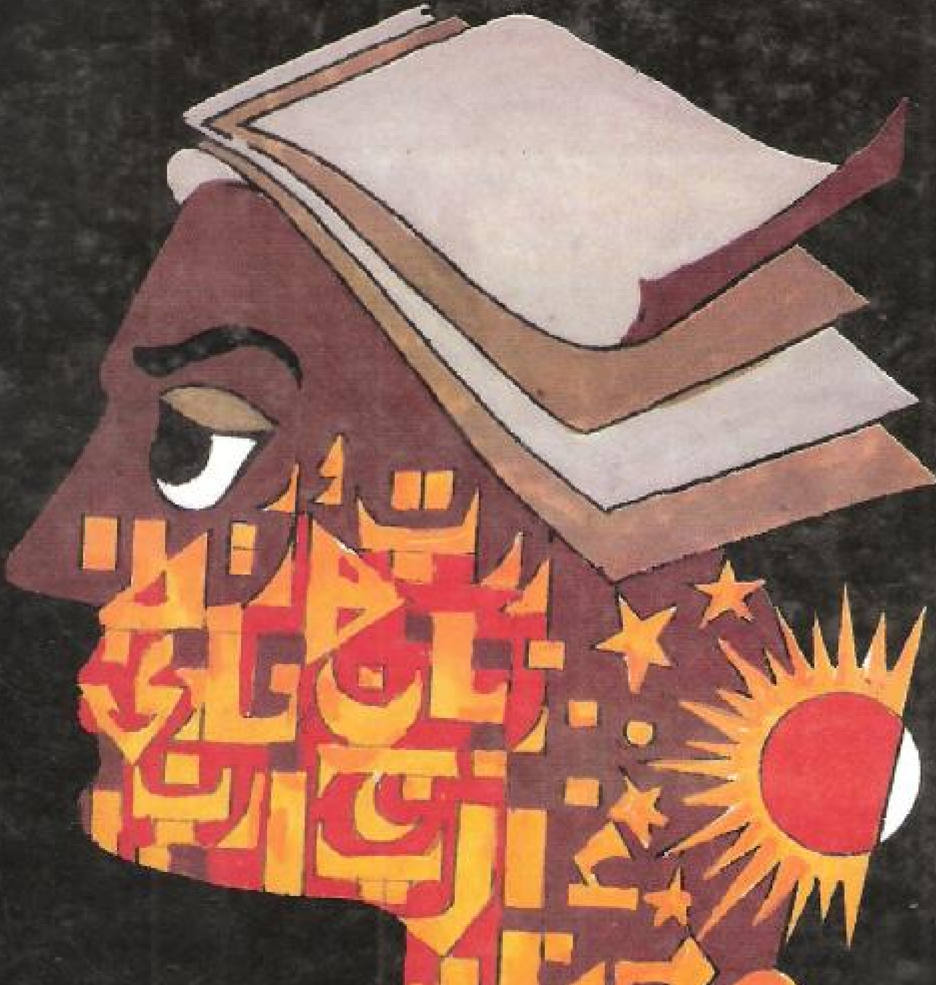

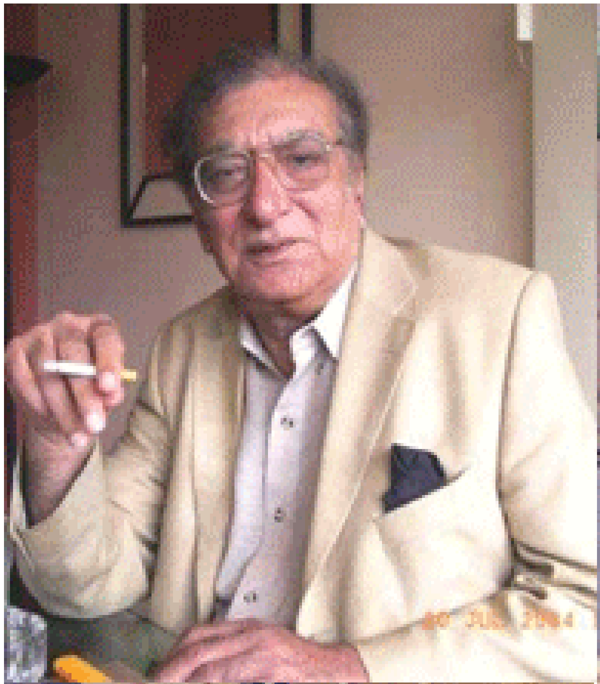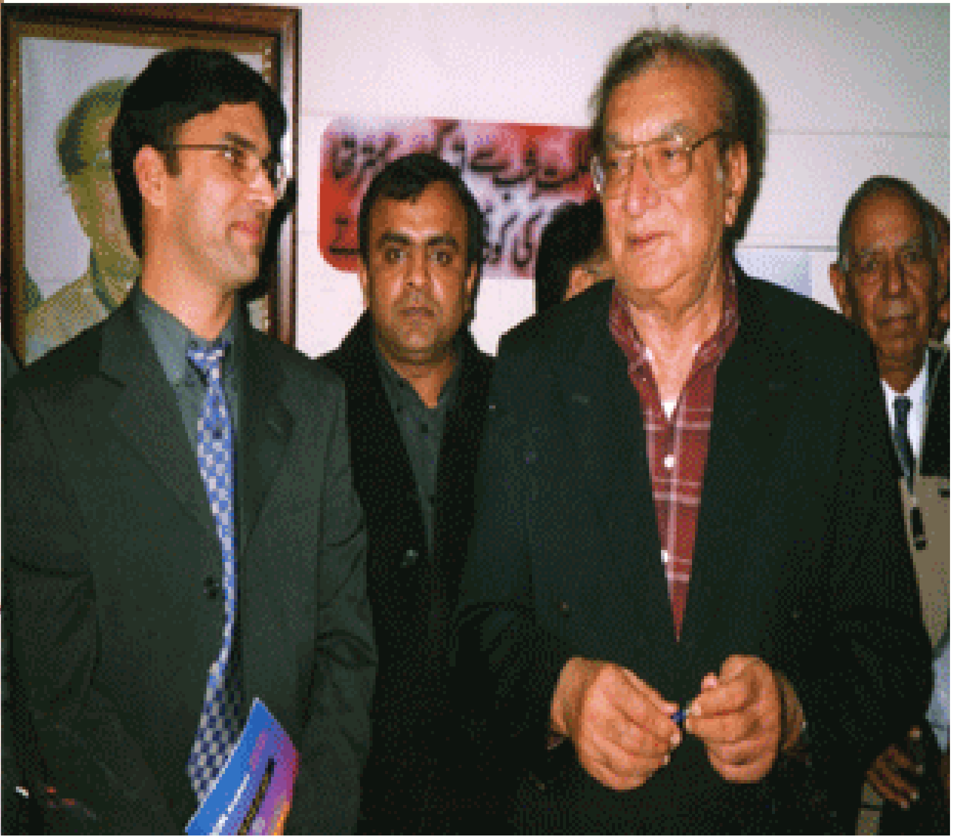گلزار جاوید